فصلنامہ راہ اسلام

شمارہ : ۱۸۲ - اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۱ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر

محمد حسن مظفری

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۳۳۸۳۲۳۲-۳۴

فیکس: ۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

E-mail:mozafarihasan@yahoo.com

ادارتی و دیگر معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر بھی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۳۳۔ مہارشی کروے روڈ (ایم۔ کے۔ روڈ) بالمقابل چرنی روڈ، ریلوے اسٹیشن۔ بمبئی

*اعزازی ایڈیٹر:
ڈاکٹر اختر مہدی

*همکاران مجلّه:

*تزئین کار: مجید احمدی
*کتابت : قاری محمد یاسین
*ناشر: خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران
۱۸۔ تلک مارگ۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریات کا مظہر ہونا لازمی نہیں۔

فہرست

	موضوعات		صفحہ
۱	اداریہ: مظلوم افغانستان... مداخلت کا میدان	ادارہ	۴
۲	پروفیسر واعظ زادہ خراسانی...	ملاقات و گفتگو	۹
۳	بے چین امام	از: دبیر سیتاپوری	۲۶
۴	نہج البلاغہ: عوام اور حکومت کے باہمی حقوق	از: ڈاکٹر محمد مہدی رکنی یزدی	۲۸
۵	شاہ مرداں، شیر یزداں، قوت پروردگار،	از: پروفیسر نثار احمد فاروقی	۳۹
۶	عالمی دہشت گردی	از: ڈاکٹر اختر مہدی	۴۷
۷	شعر: نئی صبح	از: ڈاکٹر پیکر جعفری	۵۲
۸	غالب کے دور میں فارسی نثر	از: نکہت فاطمہ	۵۴
۹	پنجتن پاک اہل عبا کے فضائل پر ایک نظر	از: قاضی سید شاہ رفیع الدین قادری	۶۳
۱۰	کلام اقبال اور ذکر علیؑ	از: حسن ثنیٰ	۶۹
۱۱	نہج البلاغہ اسلامی فلسفہ و عرفان کا سرچشمہ	از: رضا عباس	۷۸
۱۲	شعر: معراج رسول	از: کوثر نیازی	۸۴
۱۳	عبادت اور دعا... ایک مختصر جائزہ	از: پروفیسر شاہ وسیم	۸۵
۱۴	ایران کا فن تعمیر		۹۳
۱۵	مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی	از: محمد حسن مظفری	۱۰۰
۱۶	اقبال: فارسی دانشوروں کی نظر میں	از: ڈاکٹر محمد امین عامر	۱۰۷
۱۷	تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک	از: پروفیسر سید جعفر رضا	۱۱۳
۱۸	حجۃ الاسلام... جناب محمود محمدی عراقی	اجمالی تعارف	۱۴۴
۱۹	عالمی ادارۂ نمائشگاہ قرآن	اجمالی تعارف	۱۴۷
۲۰	کل ہند "خواتین اسلام" کا سالانہ اجتماع	اجمالی رپورٹ	۱۵۱

اداریہ:

مظلوم افغانستان

یعنی

بڑی طاقتوں کی رقابت و مداخلت کا میدان

افغانستان دنیا کے فقیر و مفلس و پسماندہ ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ سے یہ ملک مشرقی و مغربی بڑی طاقتوں کی رقابت کا میدان بنا ہوا ہے اور اس ملک کے مظلوم عوام وحشیانہ بیرونی حملات کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اس ملک کے لاکھوں فوجی و غیر فوجی افراد، جن میں مرد و عورت اور بوڑھے و بچے سبھی شامل ہیں، یا آوارہ وطنی و بے سر و سامانی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں یا موت کے گھاٹ لگائے جا چکے ہیں۔ اس ملک کے مفکرین و ماہرین دنیا کے دوسرے ملکوں میں پناہ گزین ہیں اور افغانستانی عوام ان دانشوروں کی خدمت و قیادت سے پوری طرح محروم ہیں۔ اس ملک کے عوام فقط تعلیم و تربیت، صحت و سلامتی، ہر قسم کے سیاسی اور اقتصادی حقوق سے ہی نہیں بلکہ بنیادی طور پر حق حیات سے بھی پوری طرح محروم ہو چکے ہیں۔ گذشتہ دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ سے اس ملک کے خلاف کی جانے والی جنگی کارروائیوں کی وجہ سے افغانی عوام آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں سے بھی خوفزدہ رہنے لگے ہیں کیونکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ ستارہ نہیں بلکہ بم ہو جو ان بے دفاع لوگوں کو نیست و نابود کر ڈالے۔ یہاں کے پہاڑی اور میدانی علاقوں اور کھیتوں میں اناج کی کھیتی کے بجائے دھماکہ خیز بارودی سرنگوں کا جال بچھا دیا گیا ہے جو آنے والے وقت میں بھی افغانی عوام کی تباہی و بربادی کا باعث ہوں گی۔ پس یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس طویل مدت کے دوران افغانستان میں آسمان سے خطروں کی بارش ہو رہی تھی اور یہاں کی زمین خوف و دہشت اگل رہی تھی۔ ایسے تاریک و مایوس کن ماحول میں دنیا کی نگاہیں اس ملک کے مستقبل پر لگی ہوئی ہیں اور یہ خیال کیا جا رہا

ہے کہ ممکن ہے حالات میں رونما ہونے والی حالیہ تبدیلی اور نئی حکومت کی تشکیل سے امید کی صبح نمودار ہو جائے اور اس سرزمین کے مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کو بھی اچھے اور درخشاں مستقبل کی خوشخبری حاصل ہو جائے۔

درحقیقت یہ تباہی و بربادی دنیا کے کمزور و پسماندہ ملکوں کے عوام کی قسمت کے فیصلے میں بیرونی بالخصوص دنیا کی بڑی طاقتوں کی مداخلت کا نتیجہ ہے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے بیشمار لوگ انسان کی ذاتی یا جماعتی وسعت پسندی اور زیادہ طلبی کا شکار بنتے چلے آرہے ہیں اور افغانستان اس منحوس دیو کی ظالمانہ راہ و روش کا شکار بننے والا پہلا اور آخری ملک نہیں ہے۔ دنیائے بشریت گذشتہ ایک صدی کے دوران دو تباہ کن عالمی جنگوں کو جھیل چکی ہے چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں کامیابی حاصل کرنے والے ملکوں نے تنظیم اقوام متحدہ کا منشور ترتیب دیا اور اس تنظیم کی تشکیل کے ذریعہ دنیا والوں کو ایک روشن مستقبل کا امیدوار بنادیا۔ تنظیم اقوام متحدہ کے منشور کے مقدمہ میں، جو ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو تمام ممبر ملکوں کی حمایت سے منظور اور لاگو ہوا، نہایت واضح لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ:

ہم اقوام متحدہ کے جملہ اراکین نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

ہماری زندگی کے دوران رونما ہونے والی دو عالمی جنگوں میں دنیائے بشریت کو مختلف النوع مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ہے لہذا ہم آئندہ نسل کو جنگ کے مصائب سے محفوظ رکھیں گے۔

ہم انسان کے بنیادی حقوق، ان کی عزت و آبرو، مرد و عورت کے مساوی حقوق اور دنیا کی چھوٹی بڑی ملتوں کے درمیان مساوات اور برابری پر زور دیں گے۔

ہم ایسے حالات پیدا کریں گے جس میں عدالت اور تمام بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں کا بھرپور احترام کیا جائے گا۔

ہم انسان کی سماجی ترقی کی زمین ہموار کریں گے تاکہ بہتر معیاروں کے ساتھ انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو سکے۔ ان اغراض و مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہم تمام ممبر ملکوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تحمل و بردباری سے کام لیتے ہوئے اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ صلح آمیز زندگی بسر کریں گے۔

صلح وسلامتی کے قیام ودوام کی خاطر ہم آپسی تعاون کی تقویت میں سرگرم رہیں گے۔

بنیادی اصولوں کو قبول کرتے ہوئے اور اپنی راہ وروش کو ان بنیادی اصولوں کا پیرو قرار دیتے ہوئے ہم ممبر ممالک یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ فوجی طاقت کا سہارا نہ لیتے ہوئے مشترکہ مفاد ومنافع کی حفاظت کریں گے اور دنیا کے تمام لوگوں کے سماجی واقتصادی حالات کی ترقی کی ترویج کے لئے تمام بین الاقوامی وسائل وامکانات کا بھرپور استعمال کریں گے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں بالخصوص بڑی طاقتوں نے ان وعدوں پر عمل نہیں کیا بلکہ عالمی سلامتی کاؤنسل کے بعض دائمی ممبر ملکوں نے، جو اقوام متحدہ منشور کی دفعہ ۔۷۰ کے مطابق عالمی صلح وسلامتی کے محافظ ہیں، عالمی سطح پر صلح وسلامتی کے قیام ودوام کی کوشش نہیں کی اور اپنی راہ وروش کو اس عالمی تنظیم کا پیرو نہیں بنایا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ منشور نے ان دائمی ممبروں کو Veto Power نامی جو خصوصی قانونی حق دیا تھا اسے ان ملکوں نے اپنی وسعت طلبانہ خواہشات کی تکمیل اور عالمی سطح پر اپنا غیر قانونی رعب ودبدبہ قائم کرنے کے لئے استعمال کیا۔

افغانستان کی گذشتہ بیس سالہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اقتصادی، ثقافتی اور سماجی اعتبار سے پسماندہ ملک میں بھی، جس کی عالمی اور آزاد بحری راہوں تک کوئی رسائی نہیں ہے، بڑی طاقتوں کی غیر قانونی مداخلت عالمی صلح وسلامتی کے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ ۱۹۷۸ء میں جب ترا کی نے سوویت یونین کی بھرپور حمایت کے ساتھ افغانستان جیسے فقیر اور غیر صنعتی ملک میں کمیونسٹی بغاوت کا سلسلہ شروع کیا تو اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے آقا کی وسعت پسندی اور اقتدار طلبی آئندہ بیس سال تک افغانی عوام کی تباہی وبربادی اور قتل وغارتگری کا باعث ہو جائے گی، دیکھتے ہی دیکھتے سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور خود حملہ آوروں کی قربانی کا سبب بن جائے گا۔ واضح رہے کہ افغانستان میں کمیونسٹی فوجی بغاوت کے ساتھ طرح طرح کی مجاہدین جماعتیں بھی ابھر کر سامنے آگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان میں مغربی سرمایہ دارانہ بڑی طاقت کی مداخلت کے لئے زمین ہموار اور ماحول سازگار ہو گیا۔

۱۹۷۹ء میں تراکی کے ہاتھوں افغانی عوام کے وسیع قتل عام کے باوجود حالات بہتر نہ ہوئے۔ حفیظ اللہ امین نے تراکی کے قتل کے بعد اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ اسی سال دسمبر کے مہینے میں افغانستان میں روسی فوج کی آمد کے ساتھ اس ملک میں بیرونی اور بڑی طاقت کی براہ راست فوجی مداخلت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ دوسری طرف تنظیم القاعدہ جس کے خلاف آج امریکہ غیر معمولی زمینی اور ہوائی جنگ میں سرگرم ہے، کے مجاہدین امریکی وسائل وامکانات کا استعمال کرتے ہوئے دنیا کے مختلف علاقوں سے افغانستان لائے گئے تھے تاکہ وہ روسی حملہ آوروں کو اس سرزمین سے باہر نکال سکیں۔ شاید اس وقت امریکہ القاعدہ سے وابستہ جنگجو جوانوں کو آلہ کار کی حیثیت سے استعمال کرتے ہوئے اس علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور مکمل تسلط قائم کرنے کی فکر میں سرگرداں تھا کیونکہ ایران میں شاہی حکومت کی نابودی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کی وجہ سے اس علاقے میں امریکی اثر ورسوخ محدود ہو گئے تھے۔ بہر حال دس سال کی لگاتار مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے افغانستان پر مسلط روسی کٹھ پتلی حکومت کی چولیں ہل گئیں اور حکومت کی باگڈور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونے لگی۔ حفیظ سے کارمل اور کارمل سے نجیب اللہ نے افغانی حکومت کی باغ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی لیکن ان میں سے کوئی بھی افغانی حکمراں مشرقی بڑی طاقت کے ارمانات کو پورا نہ کر سکا۔ آخر کار سوویت یونین کو افغانستان پر اپنے دس سالہ غاصبانہ تسلط کی بھاری قیمت چکانی پڑی اور ہزاروں فوجیوں کے قتل کے بعد روسی فوج کو ۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء کو شرمناک شکست کے ساتھ افغانستان کی سرحدوں سے باہر نکلنا پڑا اور ۱۵ر اپریل ۱۹۹۲ء کو مجاہدین نے کابل کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ مغربی بالخصوص امریکی حمایت کے سایہ میں افغانی مجاہدوں نے بیرونی حملہ آوروں کو تو نکال دیا لیکن افغانی مجاہدوں کی جماعتوں کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے باہمی قتل وغارتگری کا سلسلہ جاری ہو گیا اور سرزمین افغانستان میں صلح وسلامتی کی فضا بحال نہ ہو سکی۔

ایسے حالات میں مغربی اور بعض علاقائی ملکوں کی بھرپور حمایت کے ساتھ افغانستان میں صلح وسلامتی قائم کرنے کے لئے ۱۹۹۴ء میں طالبان اس ملک کے سیاسی میدان میں داخل ہوئے تاکہ نہایت آسانی کے ساتھ اس علاقے میں گیس پائپ لائن بچھائی جا سکے اور مشرق وسطیٰ کے معدنی ذخائر

یعنی گیس اور دیگر اشیاء کو اس علاقے میں منتقل کیا جاسکے۔ ۲ سال کی مسلسل جنگ وخونریزی کے بعد ۱۹۹۶ء میں طالبان نے کابل پر قبضہ جمالیا۔ اپنی کم مدت حکومت کے دوران افغانستان کے اکثر بڑے علاقوں مثلاً مزار شریف وغیرہ میں طالبان نے افغانی عوام بالخصوص ہزارہ جماعت کے لوگوں کا اعلانیہ قتل عام بھی کیا۔ مزار شریف نامی بڑے افغانی شہر پر اپنے وحشیانہ حملوں کے دوران طالبانی فوج نے اس شہر میں واقع اسلامی جمہوریہ ایران کے سفارتی مشن پر دھاوا بول دیا اور نہایت بیرحمی کے ساتھ سفارتخانہ کی عمارت کے تہہ خانے میں تمام ایرانی سفارت کاروں نیز ایک ایرانی صحافی کو بھی قتل کرڈالا۔ جماعت طالبان نے اپنی چند سالہ حکومت کے دوران ایرانی سفارت کاروں کے قاتلوں کے خلاف کسی طرح کی قانونی چارہ جوئی کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

اگرچہ آج بھی امریکہ کا یہ دعویٰ دنیا کی کسی عدالت میں ثابت نہیں ہوسکا کہ نیویارک میں عالمی تجارتی مرکز اور پنٹاگن کی عمارتوں پر جو جو دھماکہ خیز حملے ہوئے ہیں وہ طالبانی خودکش افراد نے کئے ہیں یا ان حملوں میں طالبان ملوث تھے نیز یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ ان حملوں میں طالبان کس حد تک شریک رہے ہیں لیکن یہ بات ایک مسلم الثبوت حقیقت کی طرح ابھر کر سامنے آچکی ہے کہ بڑی طاقتوں کی مداخلت چاہے وہ دنیا کے دور افتادہ اور پسماندہ ترین ملک میں ہی کیوں نہ کی گئی ہو، عالمی صلح وسلامتی کے لئے بہت بڑا اور مہلک خطرہ بن سکتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور اور بنیادی اصول وآئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جس میں اقوام عالم کے درمیان عدالت ومساوات کے قیام اور دو ملکوں کے درمیان اختلاف کو غیر مسلحانہ طریقوں سے حل کرنے کی بات کہی گئی ہے، آج کی بعض بڑی طاقتوں نے بین الاقوامی روابط پر فوجی ماحول کو مسلط کردیا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے صلح دوست افراد وعوام بے حد پریشان ہیں۔

ایسے افسردہ ماحول میں بارگاہ عالیہ خداوندی سے یہ امید ہے کہ وہ ملت اسلامیہ افغانستان کو خوشحالی اور اقوام عالم کو حقیقی صلح وسلامتی عطا فرمائے اور بین الاقوامی روابط کے سلسلے میں مہلک طاقتوں کو نہیں بلکہ عقل ومنطق اور عدالت وسعادت کو بالادستی حاصل ہوجائے۔ آمین

☆☆☆☆

عالمی تنظیم تقریب مذاہب اسلامی کے جنرل سکریٹری

پروفیسر واعظ زادہ خراسانی

سے ملاقات و گفتگو

مختلف اسلامی جماعتوں کے درمیان وحدت اسلامی کی تشکیل ہمیشہ سے ایک اہم ضرورت رہی ہے اور مسلم مفکرین و دانشوروں کی ایک بڑی جماعت کی یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی مذاہب کے درمیان وحدت و اتحاد اور قربت و ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ گذشتہ صدی کے دوران شیخ محمود شلتوت، شیخ محمد عبدہ، سید قطب، علامہ بروجردی، آیت اللہ مرعشی نجفی، سید جمال الدین اسد آبادی اور شیخ حسن البنا جیسے نامور علماء و دانشوروں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کی بھرپور کوشش کی۔ ان بزرگوں کی کوششوں کو آگے بڑھاتے ہوئے گذشتہ چند دہائیوں کے دوران علامہ اقبال اور امام خمینی نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً موثر اور سود مند ثابت ہوئی ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کے لئے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں پوری طرح سرگرم عمل ہیں۔ تنظیم تقریب مذاہب اسلامی انہیں اداروں میں سے ایک ہے جو ہر سال عالمی سطح پر ایک عظیم اسلامی اجتماع کا اہتمام کرتا ہے جس میں شرکت کرنے والے دانشور حضرات اپنے مقالات کے ذریعہ لوگوں کو باہمی اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔

ذیل میں اس تنظیم کے جنرل سکریٹری واعظ زادہ خراسانی سے کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ حاضر خدمت ہے۔

سوال: اسلامی مذاہب میں حکومت کا تصور دسویں وحدت اسلامی عالمی کانفرنس کا خصوصی

موضوع رہا ہے۔اس موضوع کے انتخاب کی وجہ کیا تھی؟

جواب: حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی قیادت کے سایہ میں ایران میں عظیم الشان اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں سیاسی اور علمی ماہرین کے درمیان "اسلامی حکومت" کے موضوع پر بحث و مباحثہ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا اہم ترین اسلامی موضوع بن گیا۔اس زمانہ میں پہلے ہی سے موجود اسلامی تحریکوں کی رفتار بڑھ گئی اور اسلامی اداروں نیز تنظیموں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی چلی گئی اور آج یہ تمام اسلامی ادارے اور تنظیمیں اپنے مشن میں ہمہ تن سرگرم ہیں بس فرق یہ ہے کہ ان میں سے بعض اداروں کا گرما گرم سیاسی یا فوجی جدوجہد سے کوئی سروکار نہیں ہے اور بعض تنظیموں میں یہ دونوں عنصر بھی موجود ہیں۔

آج بھی عالمی سیاسی فرہنگ وثقافت میں ان اسلامی وسیاسی تحریکوں کی مختلف تعبیرات پیش کی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں ان تحریکوں کو "الصحوہ اسلامیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغربی واسلام دشمن جماعت سے وابستہ افراد اور ادارے اس کو "اسلامی بنیاد پرستی" کے نام سے خطاب کرتے ہیں البتہ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھنا لازمی ہے کہ اہل مغرب کی منطق کے بموجب بنیاد پرستی کو تشدد اور دہشت گردی کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔ دنیائے اسلام کے کسی ایک علاقہ میں رونما ہونے والی سیاسی تحریکیں کبھی کبھی تشدد آمیز اور قتل وغارتگری کی حامل رہی ہیں لیکن اسلام دشمن جماعتوں، سامراجی محاذوں اور دو عالمی صہیونیت کے ٹھیکیداروں نے ہر اسلامی تحریک کو قتل وغارتگری اور دہشت گردی سے جوڑ دیا۔

اس مختصر سی تمہید کے ساتھ مختلف مذاہب ومکاتب فکر کے مطابق "اسلامی حکومت" کے بارے میں بحث ومباحثہ کی ضرورت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کیونکہ ہر اسلامی ملک میں ایک اسلامی مذہب رائج ہے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر اس اسلامی ملک یا علاقے میں اسلامی تحریک کامیاب ہو جائے تو اسی مذہب کے سیاسی قوانین کی بنیاد پر ہی حکومت کی تشکیل کی جانی چاہئے۔ دوسری طرف ان میں سے اکثر تحریکوں میں لازمی علم اور اس علاقے میں رائج مذہب کے لئے قابل قبول قانون اور

مرتب پروگرام کا فقدان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی علاقوں میں رونما ہونے والی اکثر سیاسی تحریکوں میں فقہ یعنی مذہبی اصول و قوانین کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ تحریکوں سے وابستہ لوگ کسی فقیہ کو اپنے درمیان نہیں آنے دیتے یا حکومت کے لئے فقہ اور فقہا کی موجودگی کی اہمیت سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں اور دنیائے اسلام کے لئے یہ بذات خود ایک بہت بڑا سانحہ اور حادثہ ہے کہ دنیا کے کسی اسلامی علاقے میں اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آئے اور اس میں فقہ یا فقہا کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین اور مغربی نظام حکومت کی مخلوط اور کھچڑی حکومت کی تشکیل عمل میں آجائے یا پھر ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بعض محرمات کی روک تھام مثلاً مراکز فساد اور قمار خانوں پر کڑی پابندی کی حد تک ہی محدود رہ جائے۔ (جیسا کہ رفاہ پارٹی نے ترکی میں کر رکھا ہے) اور مالی، اقتصادی قانونی اور عدالتی شعبوں میں مفصل اسلامی احکام کو صرف یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ یہ اسلامی قوانین موجودہ دنیا میں رائج قوانین سے میل نہیں کھاتے ہیں اور ان کی جگہ پر ایسے احکام و قوانین کو گلے لگایا جائے جو اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو قوانین اسلام کی روح سے میل نہ کھاتے ہوں انہیں اسلام کے نام سے اسلامی حکومت کی چھتری کے سایہ میں مسلمانوں پر مسلط کر دیا جائے۔

ان اسلامی تحریکوں کے لئے دوسرا بڑا اور مہلک خطرہ یہ ہے کہ عالمی سامراج، بین الاقوامی صہیونیت اور ثقافتی حملات کے سلسلے میں ان اسلامی تحریکوں کے درمیان غیر معمولی اختلافات موجود ہیں اور مذکورہ مسائل کے سلسلے میں اسلامی ممالک میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان اسلامی تحریکوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت کے سلسلے میں الگ الگ موقف اختیار کر رکھا ہے مثلاً ایک مقالہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مصر میں سردست دس اسلامی تحریکیں سرگرم عمل ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک تحریک انقلاب اسلامی ایران کی حمایت کرتی ہے بقیہ تحریکیں یا ایران کی مخالف ہیں یا اس سے بالکل بیگانہ ہیں۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تحریکیں کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مسند اقتدار تک پہونچ جاتی ہیں تو ان کے درمیان اس قسم کے اختلافات اور بڑھ جائیں گے اور ان اختلافات کا

آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی تحریکوں نے اس ملک میں کامیابی تو حاصل کرلی ہے لیکن ان کی راہ وروش میں موجود بنیادی اختلافات کی وجہ سے اب تک اس ملک میں استحکام نہیں پیدا ہو سکا جبکہ تمام افغانی تحریکیں اسلامی اور جہادی ہونے کی دعویدار ہیں۔

ہم اسلامی مذاہب کے نقطہ نظر سے حکومت کے فلسفے کو پوری طرح واضح کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کریں گے کہ لوگوں کے افکار وعقائد کے درمیان قربت ونزدیکی پیدا ہو اور جہاں تک ممکن ہو اسلامی تحریکیں واحد لائحہ عمل کو بروئے کار لاتے ہوئے آگے قدم بڑھائیں یا پھر ان کی راہ وروش میں قربت ونزدیکی پیدا ہو جائے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی وہ اسباب وعوامل ہیں جن کے ذریعہ انقلاب اسلامی ایران نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں اگر مختلف جماعتوں کے درمیان فکری قربت ونزدیکی کو انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کا راز کہا جائے تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا۔

سوال: اسلامی مذاہب اور فرقوں میں موجود فقہی میراث میں اسلامی حکومت کے موضوع پر کس حد تک گفتگو کی گئی ہے اور سنی وشیعہ جماعتوں میں سے کس فرقہ کے علماء نے اس سلسلے میں زیادہ علمی کام انجام دئے ہیں۔

جواب: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک "اسلامی حکومت" کے سلسلے میں دو طرح کی بحث وعلمی کاوش عمل میں آئی ہے۔ان میں سے ایک خلافت وامامت کا موضوع ہے اور یہ کہ کیا حکومت کی بنیاد نص ہے یا شورا؟ یہ سنی اور شیعہ مذاہب کے درمیان ہونیوالی وہی طولانی بحث ہے جس کا شمار گرم ترین کلامی بحث میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سے زیادہ بے فائدہ کوئی دوسری بحث نہیں ہو سکتی۔اس طولانی بحث کی تکرار کی بنیادی وجہ دونوں مذاہب کی پیروری کرنیوالوں کے درمیان موجود حساسیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور معاشرہ میں رائج نظام اور حکومتوں نے بھی اس بحث سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس اختلاف کو فروغ دینے میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے اور ان مذاہب کے علماء نے اپنے طرفداروں کے درمیان اپنی حیثیت کو اور زیادہ مستحکم اور موثر بنائے رکھنے کے لئے ان اختلافات کو قائم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور دونوں حق کا دفاع کرتے رہے ہیں۔

لیکن ہم نے اس بحث کو بے قابو اور بے فائدہ ترین بحث اس وجہ سے کہا ہے کہ اس بحث کا تعلق ماضی سے ہے اور مسلمانوں کی موجود حالت کو سنوارنے میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اس سے نقصان زیادہ ہوتا ہے اور اس سے مسلمانوں کے درمیان عداوت و دشمنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جی ہاں! حکومت کی بنیاد کے سلسلے میں سنی اور شیعہ جماعتوں کے درمیان موجود یہ اختلاف مسلمانوں کے موجودہ سیاسی لائحہ عمل میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی عداوت اور محاذ آرائی نہ ہونی چاہئے کہ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگیں یا ایک جماعت دوسری جماعت کے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف، بدعتی اور مشرک کہنے لگے۔ جی نہیں امت مسلمہ کے درمیان اختلاف کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی بحث سے کبھی کوئی نتیجہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

بحث کی دوسری نوعیت اسلام کی موجودہ فقہی میراث میں اسلامی حکومت کے سلسلے میں ہے اور یہ وہی تعمیری بحث ہے جو "احکام السلطانیہ" جیسی کتابوں اور مذہب اہلسنت کی فقہی کتابوں میں موجود سیاسی مباحث سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن مذہب شیعہ کے اعتبار سے یہ بحث متاخرین کی کتابوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی صفوی دور حکومت اور اس کے بعد کے عہد میں، جب سیاسی اقتدار کی باگ ڈور شیعوں کے ہاتھ میں تھی، ان مباحث پر سیر حاصل بحث دکھائی دیتی ہے جیسے "راضی خراجیہ"، "احکام اھل کتاب" یا "اھل ذمہ"، "جہاد با کفار"، "سلطنت کی مشروعیت کی کسوٹی" یا "حکومت مشروطہ" اور فقہا و سلاطین کے درمیان سیاسی مسائل کے سلسلے میں انجام پانے والی بحث وغیرہ لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مفصل اور بنیادی اہمیت والی بحث "فقیہ کا دائرہ اختیارات اور" فقیہ کی ولایت مطلقہ کا نظریہ ہے جو بظاہر صفوی دور حکومت کے اواخر اور قاجاری حکومت کے ابتدائی دور میں بالکل واضح انداز میں شیعی فقہ کا اہم حصہ بن گیا۔ اس سے قبل اس سلسلے میں جو بھی بحث عمل میں آئی وہ نہایت مختصر اور معنی و مفہوم سے عاری نظر آتی ہے اور وہ بھی فقہی کتابوں میں مختلف ابواب کے ذیل میں اس موضوع کی طرف اجمالی انداز میں اشارہ دکھائی دیتا ہے جیسے باب قضا، حدود، زکوۃ اور نماز جمعہ وغیرہ میں اس موضوع کی ہلکی سی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں قدماء کی کتابوں کے مطالعے کے ذریعہ اس بات کی

تحقیق ضروری ہے کہ شیعہ علماء میں سے کس عالم دین نے اس موضوع پر پہلی بار بحث کی ہے اور موضوع امامت سے متعلق کلامی بحث سے الگ ہٹ کر ولایت فقیہ کی بات کہی ہے۔

لیکن اس حقیقت کا اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی امور و معاملات اور اسلامی حکومت کا تصور صدر اسلام ہی سے اہل سنت کی فقہی اور کلامی کتابوں میں موجود رہا ہے اور اس کے مختلف حصوں کو اجاگر کرنے کے لئے علماء نے نہایت مفید جواب فراہم کئے ہیں چنانچہ موجودہ دور میں اسلامی حکومت کے موضوع پر ایران میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ان کتابوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

انصاف سے دیکھا جائے تو اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد شیعہ مذہب کے علماء بالخصوص ایرانی علماء نے اس موضوع کے بارے میں بہت کام کیا ہے اور یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ اگر دوسرے مسلمان حضرات اسلامی حکومت کی بحث کو آگے بڑھانا چاہیں تو انہیں بہر حال عصر حاضر کے شیعہ علما کے علمی آثار کا سہارا لینا پڑے گا۔

سوال: اسلامی جمہوریہ ایران کے سیاسی ڈھانچے میں فقیہ کی ولایت مطلقہ کو بنیادی محور و مرکز قرار دیا گیا ہے۔ کیا علمائے اہلسنت بھی اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں؟

جواب: اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو ولایت فقیہ ایک شیعی اصطلاح ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں کے دوران منظر عام پر آئی ہے۔ ماضی میں اہلسنت بھی اسلامی حاکم یا خلیفہ کا عالم ہونا اور فقیہ ہونا لازمی سمجھتے تھے جو کتاب و سنت نبوی کی حد تک "ولایت مطلقہ فقیہ" کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

مثلاً زکوۃ لینا، تیموں کی سرپرستی کرنا، قاضی اور ائمہ جمعہ و جماعت کی تقرری کرنا، جنگ و صلح کا فرمان جاری کرنا اور حکومت سے متعلق دیگر تمام امور کے بارے میں، جن کا ذکر "احکام السلطانیہ" جیسی کتابوں میں موجود ہے، آخری فیصلہ اسلامی حاکم کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہلسنت اسلامی حکمراں کے لئے زیادہ اختیارات کے قائل ہیں جو کسی حد تک "ولایت مطلقہ فقیہ" سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن اہلسنت اس کو ولایت فقیہ نہیں بلکہ "اختیارات حاکم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سوال: دینی افکار و عقائد کے احیاء میں امام خمینی نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ مسلمان دانشوروں نے سیاسی مسائل کو کس حد تک دین مبین اسلام کی روشنی میں دیکھنا شروع کر دیا ہے؟

جواب: اس سلسلے میں "دینی افکار کا احیاء اور امام خمینی" کے عنوان سے میرا ایک مفصل مقالہ امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے اور یہ کتاب آستان قدس رضوی نامی تنظیم کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس مقالے میں میں نے بڑی تفصیل سے حقیقی اسلامی افکار و عقائد کی تجدید میں امام خمینی کی ہمہ جہتی خدمات کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ سب سے پہلے میں اسلام کی حقیقی تعریف اور اس کی گوناگوں صفات کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں میں نے اسلام کی آٹھ ایسی صفات کا ذکر کیا ہے جس کو لوگ بھلائے بیٹھے تھے اور اسلامی احکام کی بنیاد پر اسلامی حکومت کی تشکیل ان آٹھ صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔ اس کے بعد میں نے ان فراموش شدہ صفات میں سے ہر ایک صفت کو اجاگر کرنے میں امام خمینی کی خدمت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے اس مقالہ کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔

ماضی میں گھر، مدرسہ اور اسلامی معاشرہ میں اصول و فروع دین کو اس انداز سے پیش کیا جاتا تھا کہ مذکورہ تمام باتیں تو درست ہوا کرتی تھیں لیکن ان باتوں سے اسلام کا حقیقی چہرہ سامنے نہیں آتا تھا لیکن امام خمینی نے اسلام کے چہرے کی مکمل شناخت پیش کر دی اور اس کی مندرجہ ذیل صفات کو پوری طرح نمایاں بنا دیا۔

۱۔ وحدت ۲۔ اعدا کے خلاف جہاد۔ ۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۴۔ امت خیر ۵۔ باہمی ذمہ داری ۶۔ اصلاح کی فکر ۷۔ اسلامی غیرت ۸۔ دین کی بنیاد پر حکومت

امام خمینی نے ایران کی دینی درسگاہوں میں نیز جلاوطنی کے دوران نجف اشرف میں تقریباً ۳۰ سال بلکہ اس سے پہلے سے درس خارج دینا شروع کر دیا تھا اور وہ علماء و فضلاء نیز مجتہدین اور مدرسین کی ایک ایسی نسل کی تربیت میں پوری طرح کامیاب رہے جو امت واحدہ کے حقیقی معنی و مفہوم سے بخوبی واقف اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو، اسلام کو ایک مکمل مکتب فکر کا درجہ عطا کرتی ہو، دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کے سلسلے میں ایک مسلمان کی کیا ذمہ داری ہے اس سے بخوبی آشنا ہو۔ اسلامی

حکومت کی تشکیل کے فریضہ سے آگاہ ہو۔امام خمینی کی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھنے والے ان علماء کو اس بات کا بخوبی علم واحساس تھا کہ مسلمانوں کے جملہ امور کے سلسلے میں ان کا فریضہ کیا ہے،ان کی ذمہ داری کیا ہے اور غیر اسلامی افراد کی حفاظت کا کام کس طرح انجام دینا ہے۔یہ لوگ اس قسم کے مسائل و معاملات سے بخوبی آگاہ اور اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن آمادہ رہا کرتے ہیں۔

اگر انہیں یہ توفیق حاصل نہ ہوتی اور انہوں نے علماء ودانشوروں کی اتنی بڑی تعداد کی تربیت کا کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا تو دور دور تک ایسا کوئی نہ تھا جو حقیقی اسلام محمدی کی طرف لوگوں کو مدعو کرتا۔ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتا اور حقیقی اسلام کو جو امتیازات حاصل تھے وہ لوگوں تک پہونچانے کا کام انجام دیتا۔امام خمینی کو مزید یہ توفیق بھی حاصل ہوئی کہ وہ اپنے انہیں شاگردوں کی حمایت کے ذریعہ اسلامی حکومت قائم کریں اور اس حکومت کی بقاء وسلامتی کے لئے انہوں نے بعض دوسرے اہم عبادتی اور سیاسی فریضہ کا احیاء کیا جس کو ایرانی معاشرہ نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔دوسرے مرحلے میں انہوں نے ایرانی معاشرہ کے درمیان فریضہ حج کی ترویج و مقبولیت کا کام انجام دیا، تیسرے مرحلے میں انہیں امت اسلامیہ کو سیاسی اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے پوری طرح آزاد رکھنے کی فکر دامنگیر ہوئی اور چوتھے مرحلے میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کو اس انداز میں پیش کیا کہ پوری اسلامی دنیا اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔میں نے ان کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھا جس کو اسرائیل کے خطرے کا اتنا گہرا احساس رہا ہو۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ امام خمینی مسئلہ فلسطین کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ تھے اور فلسطینی مظلوموں کے درد کا انہیں مکمل اور غیر معمولی احساس تھا۔

امام خمینی نے اسلامی دنیا میں ان مباحث کو پیش کرتے ہوئے عملی سیاست وجدوجہد کے میدان میں قدم رکھا۔انہوں نے ان تمام پہلوؤں کے ساتھ دنیا میں اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کیا اور مسلمانوں کے خوابیدہ ضمیر کو پوری طرح بیدار کر دیا۔انہوں نے امت اسلامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے "جاگتے رہو" کی ایسی موثر آواز لگائی کہ ساری دنیا کے لوگ بالخصوص مسلمان اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور دنیائے اسلام کے دانشوروں کی جماعت بھی امام خمینی کی

آواز سے ہمہ تن بیدار ہو گئی اور سبھی لوگ اسلام کے تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں سرگرم ہو گئے۔

سوال: آج علمی اور ثقافتی معاشروں میں ولایت فقیہ اور حق حاکمیت کے درمیان رابطہ کے سلسلے میں گفتگو جاری ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ولایت فقیہ کو لوگوں کے ووٹ یا ان کی بیعت سے مشروعیت حاصل ہوتی ہے یا لوگوں کی بیعت فقط مصداق کا تعین کرتی ہے۔

جواب: ولایت فقیہ کی مشروعیت امام کے حکم واذن سے اور امام و پیغمبرن کی ولایت کی مشروعیت خداوند کے حکم و فرمان سے وابستہ ہے۔ اصولاً اسلامی نقطہ نظر سے سیوائے خداوند عالم کے کسی انسان کو دوسرے انسان پر ولایت کا حق حاصل نہیں ہے۔ تمام بنی نوع انسان خداوند عالم کی ولایت و حاکمیت کے سایہ میں زندگی بسر کرتے ہیں اور حق حاکمیت فقط قادر مطلق کو حاصل ہے۔ یہ خداوند عالم کی ذات مقدس ہے جو انبیاء، ائمہ، فقہا اور ان کے مقرر کردہ حکام کو صاحب ولایت قرار دیتا ہے۔ ولایت کا عام مفہوم و مطلب امر و نہی کا حق ہے جو اختیارات کے دائرہ میں پیش کیا گیا ہے اور تمام امور و مراتب میں جاری و ساری ہے اور اس کے تمام مراتب ولایت خداوندی سے وابستہ ہیں۔ "لہ الخلق والامر" پس ولایت کا جو مرتبہ سلسلۂ مراتب کے ساتھ خداوند عالم کی ذات پر ختم ہوتا ہے وہ ہر اعتبار سے مشروع اور جائز ہے اور مجموعی اعتبار سے تمام اسلامی فقہا یعنی سنی و شیعہ ماہرین علم فقہ اس کی حمایت و تائید کرتے ہیں اور ہر شخص پیغمبر کی نیابت میں اسلامی حکومت کا قائل ہے اور قاعدے سے ہونا بھی یہی چاہئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ حکومت کو مذہبی کام نہیں تسلیم کرتے ہیں بلکہ ایک سماجی اور عوامی کام مانتے ہیں انہیں بھی تشکیل حکومت کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے لئے خداوند عالم سے اجازت لینی چاہئے لیکن پیغمبر اسلام کی نیابت و خلافت میں نہیں بلکہ ایک مباح اور مشروع کام کی حیثیت سے جس کی شرع اجازت دیتی ہو۔

اس بنیادی بات کی مکمل وضاحت کے بعد اب اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا کہ ولایت فقیہ شرع سے وابستہ ہے یا عوام کی بیعت اور پیروی سے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف اقوال و عقائد کے بموجب اسلامی حاکم کی مشروعیت کا تعلق خدا سے ہے یہاں تک کہ عوامی اور شرعی احکام سے کوئی رابطہ نہ رکھنے والی حکومتوں کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہ بھی خداوند عالم پر متکی و منحصر ہیں۔

لیکن اسلامی حکومت کی مشروعیت، جو سلسلہ مراتب کے ساتھ خداوند عالم تک پہونچتی ہے، خداوند عالم کی نیابت کی حیثیت سے پوری طرح شرع سے وابستہ ہے کیونکہ کوئی شخص خداوند عالم کی اجازت کے بغیر اپنے آپ کو خدا کا ولی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ برادران اہلسنت، جو خلیفہ کی تقرری کے سلسلے میں ووٹ اور شوراپر انحصار کرتے ہیں اور نص پر تکیہ نہیں کرتے، خلیفہ کو پیغمبر کا جانشین اور خدا کا ولی مانتے ہیں کیونکہ لوگوں نے اس شخص کو نمایاں کردیا ہے جبکہ جو لوگ نص کے قائل ہیں وہ لوگ نہ صرف امام کی حکومت کی مشروعیت کو بنیادی طور پر منجانب خدا تسلیم کرتے ہیں بلکہ امام کے تقرر کو بھی حکم خداوندی کے مطابق مانتے ہیں اور لوگوں کے ووٹ کے ذریعہ کسی شخص کو امام اور ولی نہیں تسلیم کرتے اور غیبت کے زمانہ میں نص کے قائل افراد مرد فقیہ کی حکومت کی مشروعیت کو امام زمانہ کی اجازت کیوجہ سے مستند مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے فقط ان صاحبان ولایت کو ہی اس کام کے لئے مقرر کیا ہے جو ان کے بیان کردہ اوصاف کے حامل ہوں۔ امام زمانہ کا ارشاد گرامی ہے۔" واما من کان من الفقهاء صائنا انفسه ، حافظا لدینه ، مخالفا لهواه ومطیعا لامره "پس انہوں نے کسی شخص خاص کا تقرر نہیں کیا ہے بلکہ مذکورہ صفات کے حامل فقیہ کو" خصوصی نیابت" کا نہیں بلکہ "نیابت عامہ" کا حق حاصل ہے۔

"مخصوص نیابت" ان کی موجودگی کے ایام میں غیبت صغری کے دوران کچھ مخصوص افراد کو ہی حاصل تھی جو محدود اختیارات کے حامل تھے اور انہیں تشکیل حکومت وغیرہ کا حق حاصل نہیں تھا جیسے "نواب اربعہ" یا ان سے قبل وہ تمام افراد جو دیگر ائمہ کے نائب کی حیثیت سے دور و نزدیک کے علاقے میں تعینات تھے۔ زیدیہ جماعت والے بھی اپنے ائمہ کی مشروعیت کو "جو حسن و حسین اور فاطمہ علیہم السلام کی نسل سے ہیں، شرع کی جانب سے مقرر کی گئی صفات کے مطابق جانتے ہیں۔" کل فاطمی فقیه عادل قائم بالسیف " جی ہاں! چونکہ فقیہ کو عام نیابت حاصل ہوتی ہے لہٰذا مشروعیت کی بنیاد امام کی طرف سے بیان کی گئی صفات کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اشخاص کا تقرر قہراً عوام کی تشخیص سے وابستہ ہے لیکن یہ تشخیص بھی مخصوص شرعی اصول و ضوابط کے مطابق ہوگی۔ اب اگر عوام نے کسی شخص کو ان صفات کا حامل قرار دیدیا اور اس شخص کے سلسلے میں عمومی اتفاق حاصل

ہو گیا تو اس شخص کا فریضہ ہے کہ وہ تشکیل حکومت کا حکم جاری کرے لیکن عوام کے نمائندہ کے حیثیت سے نہیں کیونکہ اس کی حکومت کی مشروعیت کی کسوٹی عوام نہیں ہیں بلکہ ایک نائب امام کی حیثیت سے ہے کیونکہ عوام نے بھی امام کے حکم اور اصول قوانین کی پیروی کرتے ہوئے انہیں ان صفات کا مصداق تشخیص کیا ہے۔

جی ہاں! جواب یہ ہے کہ فقیہ کی حکومت کی مشروعیت کا تعلق شرع سے ہے اور عوام فقط مصداق کا تعین کرنے والے ہیں بالکل اسی طرح جیسے لازمی صفات واستعداد رکھنے والے افراد کو قاضی، امام جمعہ اور دیگر عہدوں پر مقرر کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال اس نظریہ سے قدرے مختلف ہے لیکن اس کو سمجھانے کے لئے تفصیلی بحث و تجزیہ لازمی ہے لہٰذا سر دست اس کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

سوال: اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کا ایک منظم و مفصل منصوبہ پیش کرنے میں اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی برکتوں کا تذکرہ کیجئے۔

جواب: میرا خیال ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران کا آئین ایک کامل ترین منصوبہ ہے جس کو شیعی عقائد کے مطابق اور مختصر فرق کے ساتھ دیگر اسلامی مذاہب کے عقائد کے مطابق اسلامی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور جس کے نمایاں حصوں کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ حکومت الٰہی اور رائے عامہ کے درمیان قربت و تال میل جو آج بھی بظاہر مشکل نظر آتی ہے۔

۲۔ مسئول افراد اور حکمراں طبقے کی آزادی و خود انحصاری کی حفاظت کرتے ہوئے جملہ اہم امور و معاملات میں ولی فقیہ کی حکومت قائم کرنا

۳۔ ایرانی پارلیامنٹ یا دیگر قانون ساز اداروں میں بنائے گئے قوانین کو شوریٰ نگہبان کے ذریعہ اس انداز میں کنٹرول کروانا کہ شرعی قوانین اور اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۴۔ تشخیص مصلحت اجلاس کی تشکیل کے ذریعہ قوانین میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنا۔
۵۔اس قرآنی نص کے بموجب کہ حضرت رسول اکرمؐ کے لئے بھی ایک فریضہ رہا ہے۔ مقام معظم رہبری کے ذریعہ قائد کے مشاہدین کے مسائل کا حل۔
۶۔ تین اہم حصوں یعنی حکومتی، تعاونی اور ذاتی نظام کے سایہ میں اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دینا۔
۷۔ فقہی بنیاد پر عمومی اور حکومتی اموال پر اسلامی حکومت کے اختیارات کی حدود کی تعین
۸۔اسلامی مذاہب کو سرکاری حیثیت عطا کرنا اور آئین کے متن میں ان مذاہب کا ذکر نیز اسلامی جمہوری آئین میں مذہب جعفری کی حقیقت و بنیادی حیثیت کی حفاظت کرتے ہوئے ان مذاہب کی آزادی کی حدود کا تعین کرنا۔
۹۔ حقیقی ارکان حکومت کے درمیان طاقت کی صحیح تقسیم اور ان کے درمیان توازن پر نگاہ رکھنا۔
۱۰۔ اسلامی ممالک اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ حسن روابط، خوش اخلاقی اور عمومی فرہنگ کی تبلیغ واشاعت پر زور دیتے ہوئے ملک کی خارجہ سیاست میں حکیمانہ موقف اختیار کرنا۔

سوال: بعض ملکوں میں متعدد مذاہب کا مسئلہ ایک ایسا موضوع ہے جو اسلامی فقہ کی بنیاد پر معاشرہ کی مدیریت کو مختلف النوع مشکلات سے دوچار کردیتا ہے۔ تقریب مذاہب کے اعتبار سے اس مسئلہ کا حل کیا ہے اور اس سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کا تجربہ کیسا ہے؟

جواب: شیعہ مذہب نے، جو ایرانی عوام کی اکثریت کا مذہب ہے، ملک کے آئین کو جملہ قوانین کی کسوٹی قرار دیا ہے اور آئین میں تمام دوسرے مذاہب کا احترام کرتے ہوئے ان معروف اسلامی مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو عبادات واحکام، قانونی املاک، تعلیم وتربیت، عدالت، پارلمانی انتخابات اور چھوٹے بڑے عہدوں کے لئے جدوجہد کی مکمل آزادی فراہم کی گئی ہے۔

سوال: اسلامی سیاسی مکتب فکر کے بموجب ایک اہم اور قابل تجزیہ موضوع خود حکومت کا ڈھانچہ ہے جس نے ایران میں اسلامی جمہوریت کے قالب میں عملی رنگ وروپ اختیار کیا ہے اور قانون کی حقیقی ماہیت کو مقام معظم رہبری کی حمایت وسرپرستی کے سایہ میں ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ کیا جناب عالی کی نظر میں اسلامی نظام کے لئے یہی ڈھانچہ قابل قبول ہے؟ یا اسلام کے سیاسی اصول اور

معیاری اسلامی قدروں کو دوسرے اسلامی قالب میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے؟

جواب: نہیں۔ اسلامی حکومت کو فقط "اسلامی جمہوریت" کے موجودہ ڈھانچے کی حد تک ہی محدود نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آئین میں ولایت فقیہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ہمارے حکومتی نظام کو، خواہ کسی بھی نام سے پکارا جائے، وہ درحقیقت اسلامی نظام ہے جس کو نظام ولایت فقیہ کے نام سے یاد کیا جانا زیادہ بہتر ہے۔

ایران کے آئین میں مثال کے طور پر رہبر کی بیعت اور مشاورین کے ساتھ قائد کے صلاح ومشورہ کی بات نہیں کہی گئی ہے اور یہ بات ممکن تھی کہ قائد کے مشاورین کا خصوصی طور پر ذکر کر دیا جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے حکومت کی صدارت کا کام رہبر کے ذریعہ سپرد کیا جاتا ہے آئین میں اس کا بھی ذکر آجاتا جبکہ نظام امامت ونظام خلافت میں یہ بھی بات موجود رہی ہے۔ آخر کار رہبر کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ فرائض کی تعمیل کے لئے کسی کو بھی مقرر کر سکتا ہے بالکل اسی طرح فوجی طاقتوں کے درمیان علحدگی دوسری صورتوں میں بھی ممکن ہے لیکن حقیقی اور بنیادی اعتبار سے یہ تمام فرائض رہبر سے وابستہ ہیں جو پیغمبر اور ائمہ کا جانشین ہے جیسے خلیفۃ الرسول۔ ممکن ہے کہ مسلسل تجربات کے پیش نظر اس نظام کے رنگ وروپ میں دھیرے دھیرے کچھ تبدیلیاں لازمی ہو جائیں بالکل اسی طرح جیسے وزارت عظمیٰ اور عدالتی شعبے میں شورائی طرز اور خود شورای رہبری سے متعلق دفعات کو سابق آئین سے حذف کر دیا گیا ہے اسی طرح مستقبل میں بھی تبدیلیوں کو کو بعید از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

سوال: آج۔ "اسلامی بیداری" کی لہر مشرقی ایشیا سے لیکر جنوبی افریقہ اور یورپی ومغربی ممالک میں بھی دکھائی دیتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اسلامی بیداری پوری دنیا پر چھا گئی ہے۔ اس ترقی پذیر تحریک کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلامی بیداری کی اس عالمی لہر میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کا نمایاں حصہ رہا ہے لیکن الحاد ومادیت پر مبنی ممالک کی پسماندگی اور اسلامی ممالک نیز مشرق ومغرب کے دیگر ممالک پر حاکم نظام حکومت کی شکست وناکامی کے بعد اس تحریک نے انقلابی

رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ دنیا "متمدن اور مہذب" معاشروں میں فاسد حرکتوں کی بھرمار، لامذہبیت اور بد نظمی ولاابالی پن سے پوری طرح تھک چکی ہے اور انسانی معاشرہ بلکہ عالمی انسانی برادری پہلے سے کہیں زیادہ ایک عادلانہ نظام حکومت کی محتاج ہے اور اسلامی بیداری ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ ۱۲ویں صدی معنویات اور ادیان و مذاہب کی صدی تھی بالکل اسی طرح جیسے بیسویں صدی الحادی اور مادی افکار و عقائد کی صدی ہے اور ۱۹ویں صدی علم وصنعت کی صدی کہلاتی ہے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی تشکیلات کو ۲۱ویں صدی کے سانچے میں ڈھال لیں اور ساری دنیا پر اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیں کہ موجودہ اسلامی نظام حکومت میں ۲۱ویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے

سوال: اسلامی تحریکوں میں عملی طور پر سرگرم افراد اور جماعتوں کے درمیان قربت و نزدیکی پیدا کرنے اور انہیں تفرقہ و اختلاف سے دور رکھنے میں "تقریب مذاہب" نامی تنظیم نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

جواب: جی ہاں! اسلامی بیداری اور عصر حاضر میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ رونما ہونے والی اسلامی تحریکوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ اسی بات کا ہے کہ کہیں ان کے درمیان تفرقہ و اختلاف نہ پیدا ہو جائے اسی وجہ سے عالمی ادارہ تقریب مذاہب اسلامی ہر سال عالمی وحدت اسلامی کانفرنس کے دوران نیز دیگر اجتماعات کی مدد سے ان خطروں کو دور کرنے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اگر آج عالم اسلام کی اسلامی تحریکوں کو ہم آزاد چھوڑ دیں اور ان کے لئے لائحہ عمل تیار نہ کریں اور ان کے نظریات کو اسلامی حکومت کے سیاسی نظام میں جگہ نہ دیں اور ان افراد و جماعتوں کو سطحی اختلافات کے باوجود قریب لانے کی کوشش نہ کریں تو یہ اسلامی بیداری محض ایک حادثہ بن کر رہ جائے گی۔

سوال: جناب عالی! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مختلف اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کا سفر کر چکے ہیں اور دوران سفر مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی اور سماجی لیڈروں اور نامور شخصیتوں سے ملاقات و گفتگو بھی کر چکے ہیں۔ دنیا کے سیاسی لیڈران امام خمینی کے سیاسی نظام سے کس حد تک موافق ہیں؟ ان معاشروں کے درمیان اسلامی انقلاب کا مقام کیا ہے؟ اور یہ لوگ مقدس اسلامی جمہوری نظام

سے کیا امید رکھتے ہیں؟

جواب: پہلے مرحلہ میں یہ سمجھ لیجئے کہ ان لوگوں کا نظریہ مثبت ہے۔ یہ لوگ انقلاب اسلامی ایران اور امام خمینی کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ قوی امید ہے کہ اسلامی انقلاب دنیائے اسلام کی پریشانیوں کو دور کرنے میں یقیناً کامیاب ہوگا۔ لیکن یہ ابتدائی مرحلہ کا نظریہ ہے اور اسلامی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں تقریباً عمومیت کا حامل تھا لیکن دھیرے دھیرے حکمراں طبقے کے علاوہ مسلمان علماء کی زہر افشانیوں نیز مغربی سامراج کے بے بنیاد پروپگنڈوں اور مذہب تشیع پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کی وجہ سے بعد کی منزل میں انقلاب اسلامی ایران اور امام خمینی کے سلسلے میں اسلامی افراد اور جماعتوں کے نظریہ میں مکمل تبدیلی پیدا ہوگئی۔ لیکن دنیا کے جن علاقوں میں اسلام دشمن پروپگنڈوں کی رسائی نہیں ہو سکی ہے وہ لوگ آج بھی اپنے نظریہ پر قائم ہیں اور ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم ان علاقوں پر اسلام دشمن جماعتوں کا منحوس سایہ نہ پڑنے دیں۔ مثلاً مصر میں دس سرگرم اسلامی جماعتیں موجود ہیں لیکن انمیں سے صرف ایک ہی جماعت ایسی ہے جو ایرانی انقلاب اور امام خمینی کے سلسلے میں خوش عقیدہ ہے اور باقی تمام دوسری تنظیمیں مختلف افکار و عقائد کی حامل ہیں۔

ہمارے انقلاب کی ایک اہم پریشانی یہ ہے کہ مذہب تشیع کی شناخت واشاعت کے سلسلے میں اسلامی انقلاب کے ترجمانوں کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ ان لوگوں میں سے اکثر افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ امام خمینی کے اقوال وارشادات کے برعکس یہ انقلاب اسلامی نہیں ہے بلکہ شیعی ہے۔ ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے، جو حقائق کو اپنے نظریہ کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نامناسب رد عمل پر مشتمل حوادث رونما ہونے لگتے ہیں۔ بہر حال اس داستان کی شرح بہت تفصیلی ہے جس کو ایک سوال کے جواب میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ میں کیا عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہ امام خمینی کے ابتدائی اقوال وارشادات اور ان کے بعد بعض افراد کی راہ و روش کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ معمولی نہیں ہے۔

سوال: تقریب مذاہب اسلامی عالمی تنظیم نے اسلامی انقلاب امام خمینی اور مقام معظم رہبری آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے افکار و عقائد کی پیروی کرتے ہوئے کون سے عملی قدم اٹھائے ہیں۔

جواب: اس عالمی تنظیم کی عمدہ ترین سرگرمی درحقیقت اسلامی مذاہب کے مفکرین اور دانشوروں کو اپنے اعمال واقدام کے ذریعہ متاثر کرتا رہا ہے جس کو درج ذیل انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ دارالتقریب مصر میں ۱۵ جلدی مجموعہ " رسالۃ الاسلام" کی دوبارہ اشاعت

۲۔ فصل نامہ رسالۃ التقریب کی اشاعت۔

۳۔ معاشروں کے درمیان وحدت واتحاد پیدا کرنے والے مقالات اور کتب کی عربی وفارسی زبان میں اشاعت۔

۴۔ وحدت اسلامی عالمی کانفرنس کی تشکیل۔ یہ کانفرنس ہر سال ہفتہ وحدت یعنی حضرت ختمی مرتبت محمد بن عبد اللہؐ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے موقع پر تہران میں منعقد کی جاتی ہے جس میں دنیائے اسلام کے سیکڑوں نامور علماء ودانشور حضرات شرکت کرتے ہیں اور اپنے مقالات میں ایسے سیکڑوں موضوعات کا علمی تجزیہ پیش کرتے ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں کے مختلف مذاہب کے درمیان قربت ونزدیکی اور وحدت واتحاد قائم ہوسکے۔ اس سلسلے کی ۱۹ویں عالمی کانفرنس "سازمان فرھنگ وارتباطات اسلامی کی طرف سے منعقد ہوئی تھی جس کا موضوع تھا۔ "پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت کی روشنی میں وحدت اسلامی" اس کے علاوہ ۲۰ویں عالمی کانفرنس کا موضوع "اسلامی مذاہب میں حکومت کا تصور ہے"۔

۵۔ صوبائی سطح پر بالخصوص برادران اہلسنت کی اکثریت والے وعلاقوں میں سیمیناروں کا اہتمام۔ ان سیمناروں میں یہ تنظیم بھرپور انداز میں شرکت کرتی ہے جس کے نتیجے میں برادران اہلسنت اور اہل تشیع کے درمیان اخوت وبرادری کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ مکہ معظمہ میں حج اور وحدت اسلامی" سیمینار کی تشکیل:۔ یہ سیمینار حج کے زمانے میں منعقد ہوتا ہے جس میں ساری دنیا کے مسلمان علماء ودانشور شریک ہوتے ہیں اور ہر سال اس سیمینار میں عالم اسلام کے ایک مسئلہ پر گفتگو کی جاتی ہے۔

۷۔ بیرون ملک علاقائی اور صوبائی سطح پر وحدت اسلامی کے موضوع پر مختلف اجماعات کی تشکیل جس میں اسی علاقے کے لوگوں کو مذاکرہ میں شریک کیا جاتا ہے جس علاقے میں اجتماع منعقد ہوتا ہے۔ اس

طرح کے اجتماعات درحقیقت اسلامی بھائی چارہ کی تبلیغ واشاعت میں بہت معاون اور کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔

۸۔ تنظیم کے علماء ودانشوروں کو دیگر اسلامی ملکوں میں بھیجنا اور اسلامی ممالک کے نامور افراد کو ایران مدعو کرنا۔ اس قسم کی باہمی ملاقات وگفتگو کے اہتمام کی برکت سے سنی اور شیعہ علماء کو یہ موقع فراہم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان سکیں اور دونوں مل کر وحدت اسلامی اور پرچم اسلام کی سربلندی کے لئے لازمی کوشش انجام دے سکیں۔

۹۔ مختلف اسلامی مذاہب اور فرقوں کے سلسلے میں مطالعاتی اور تحقیقاتی مراکز کی تشکیل، اسلامی فرقوں کے عقائد ونظریات کی مکمل شناخت۔ اس کے علاوہ مختلف اسلامی مذاہب سے مربوط علم فقہ۔ اصول اور کلام کا مکمل تجزیہ یہ اس عالمی تنظیم کی نہایت مفید علمی سرگرمی کی دین ہے۔ اس قسم کے چھوٹے بڑے علمی اجتماعات کو منعقد کرنے والا مرکزی دفتر قم میں واقع ہے اور یہاں باصلاحیت افراد اسلامی مذاہب کا بھرپور مطالعہ کرنے میں سرگرم رہا کرتے ہیں

ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں اب تک عربی اور فارسی زبان میں وحدت اسلامی کے موضوع پر سیکڑوں مقالات اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو مختلف اسلامی مذاہب کی مشترکہ میراث ہیں جس کے مطالعے سے اس بات کی قوی امید ہے کہ علماء و محققین کے ذہن میں غیر معمولی فکری انقلاب پیدا ہو جائے۔

۱۰۔ اسلامی مذاہب کی یونیورسٹی کا قیام۔ مختلف اسلامی مذاہب کے علوم و معارف پر مشتمل اس دانشگاہ کا قیام اس عالمی ادارہ کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس یونیورسٹی کا بنیادی مقصد مختلف اسلامی مذاہب کے مطابق علم فقہ، علم اصول اور علم کلام کی تعلیم و تحقیق کی سہولتیں فراہم کرنا ہے جس میں داخلی اور خارجی طالب علم و محققین اپنے مطالعاتی و تحقیقاتی پروگراموں میں لگے رہیں۔ اور اپنے مذہب کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ دیگر اسلامی مذاہب کے بارے میں مفید اطلاعات حاصل کر سکیں اور اس عالمانہ روش کے ذریعہ مذاہب کے درمیان اتحاد کی عملی راہ ہموار ہو سکے۔

☆☆☆☆☆☆

"بے چین امام"

از دبیر سیتاپوری

ذرا سوچو زبانوں پر یہ فرقت کا بیاں کب تک
نکالو پھانس بھی لیتے رہو گے چٹکیاں کب تک

خدا کا حق ہمارا حق نہیں یاد آتے بھولے سے
گذرتی چین سے ہے زندگی، لیکن یہاں کب تک؟

تمہارے ہر محلے میں عزاخانہ ہے مسجد ہے
بنو گے ہمارے واسطے بھی اک مکان کب تک

ہمارے ہو مگر گھیرے ہوئے ذلت گناہوں کی
رہو گے تم دعا اور بددعا کے درمیان کب تک

ارادہ نیکیوں کا ہے مگر نیکی نہیں کرتے
عدالت میں یونہی بڑھتی رہیں گی پیشیاں کب تک

کسی تنبیہ کو بے وقت کی شہنائی کہتے ہو
سنو گے دوستو، تفریح خانوں سے اذاں کب تک

خدا کی جایہ ذہنوں میں فقیروں کو بٹھایا ہے
پرائے آستانوں سے بھرو گے جھولیاں کب تک

ولا کا ہوگیا احساس وابستہ لفافوں سے
کریں گے مدح خوانی لیکے اجرت مدح خواں کب تک

بہت اچھے مقرر ہو مگر کردار سے خالی
فقط الفاظ سے کرتے رہو گے شادماں کب تک

سوا تہذیب اور اخلاق کے سب کچھ ہے کالج میں
بجاؤ گے بغیر آواز کی شہنائیاں کب تک

کسی کی یہ سپر طاقت کسی کی وہ سپر طاقت
نچائے جائیں گی کٹھ پتلیوں کو ڈوریاں کب تک

میری تلوار کی خوراک بن جائیں گے وہ مشرک
جو کہتے ہیں ستائیں گے ہمیں اللہ میاں کب تک

رہے گا انتقام خون ناحق بے زباں کب تک
پکاریں گی مجھے اک ماں کی ٹوٹی پسلیاں کب تک

کروڑوں سال سے جیسے کے تیسے حضرت شیطان
مگر ہے فکر دنیا کو رہوں گا میں جواں کب تک

امام وقت ہوں ہر روز ہر مومن سے ملتا ہوں
مگر مومن یہ کہتے ہیں رہوں گا میں نہاں کب تک

بہت عباس یاد آتے ہیں جب تم لوگ کہتے ہو
نظر آؤ گے اے مولا سر آب رواں کب تک

قیادت میں ہماری تم کو چلنا ہے جہاں والو
غلط رستوں پہ چٹخاتے پھرو گے جوتیاں کب تک

یقین مجھ پر نہیں، وابستہ مردہ رہنماؤں سے
کریں گی، آدمی کی رہبری پر چھائیاں کب تک

مراد اس سے میری آمد ہے "حق آیا گیا باطل"
نہ منزل پائے گا آخر ہمارا کارواں کب تک

ہر اک ذرہ سخن رکھتا ہے ہر شے میں تکلم ہے
میاں سچ بولنے والوں کی کاٹو گے زبان کب تک

ظفر پائیں اجل پر ارتقاء والوں کی کوشش ہے
لڑیں گی آگ سے لیکن یہ سوکھی لکڑیاں کب تک

زمیں پر آ کے پڑھتی ہے نماز ان کو میرے پیچھے
رہے گا ابن مریم کا ٹھکانا آسماں کب تک

اکھاڑیں ایک ہی جھٹکے سے باب خیبر باطل
رہیں بے تاب دیکھو یہ علیؑ کی انگلیاں کب تک

بلاتے ہو مجھے لیکن ابھی محفل سے بھاگو گے
اگر میں پوچھ لوں تم آؤ گے میرے یہاں کب تک

غذا طاہر نظر طاہر، مکیں طاہر مکاں طاہر
تمہارا گھر بنے گا لائق صاحب زماںؑ کب تک

دبیرؔ آنے کے بارے میں نہ پوچھو بلکہ یہ پوچھو
گناہوں کے لئے چھن جائیں گی آزادیاں کب تک

☆☆☆☆

اقوام متحدہ کے صدر دروازہ پر کندہ

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے اشعار درج ذیل مفہوم کے حامل ہیں

آدم کی اولاد آدمی ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی تخلیق و آفرینش ایک ہی جوہر سے ہوتی ہے۔ جب زمانہ کسی ایک عضو کو اذیت پہونچاتا ہے تو سارے اعضاء بدن بے چین و بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اگر تو کسی شخص کو رنجیدہ و غمگین دیکھ کر رنجیدہ و غمزدہ نہیں ہوتا ہے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ تیرا نام آدمی رکھا جائے یا تجھے آدمی کہکر پکارا جائے۔

نہج البلاغہ میں

عوام اور حکومت کے باہمی حقوق

ڈاکٹر محمد مہدی رکنی یزدی

انسان ایک سماجی مخلوق ہے اور سماجی زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا اہم حصہ ہے۔ اس بات کی تردید نہیں کی جاسکتی کہ زندگی میں ہر انسان ایک دوسرے کے سلسلے میں لازمی فرائض اور ذمہ داریوں کا حامل ہوا کرتا ہے اور یہ فرائض مختلف معاشروں میں احکام الٰہی یا حکومتی قوانین یا قومی اصول وضوابط کی شکل میں موجود ہیں۔ سردست ہماری گفتگو کا موضوع یہ نہیں ہے کہ یہ قوانین کس طرح وجود میں آئے اور ان کا اصل مقصد کیا ہے بلکہ ان قوانین کی ضرورت واہمیت کے بارے میں شک وتردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اگر یہ قوانین نہ ہوتے تو "جنگل راج" ہوتا اور اس طرح "الحق لمن غلب"[1] یعنی معاشرہ میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا محاورہ عملی شکل اختیار کرلیتا۔

مذہب اسلام میں اس فریضہ عمومی کو "حق" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے والدین کا حق، معلم کا حق، پڑوسی کا حق اور دوست وساتھی کا حق وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ لفظ "حق" کے حقیقی معنی و مفہوم میں لطف وعنایت کا پہلو موجود ہے۔ اسی وجہ سے اس مقصد کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے جبکہ قانون، اصول وضوابط اور وظیفہ وفریضہ جیسے الفاظ میں لطف وعنایت کا وہ پہلو کارفرما نہیں ہے کیونکہ لغت اور دائرۃ المعارف جیسی کتابوں میں "حق" کا مطلب ثابت[2] واجب ہونا اور لائق ومناسب ہونا۔[3] بیان کیا گیا ہے۔ واجب وثابت درحقیقت باطل کی ضد اور بالآخر پروردگار قادر ومتعال کا نام ہے جو حقیقی موجود[4] ہے لیکن اس مقالے میں حق سے مراد وہ چیز ہے جس کا ادا کرنا واجب ہو۔[5] فارسی دائرۃ المعارف میں حق کی اصطلاحی تعریف اس انداز میں بیان کی گئی ہے۔

"حق (جمع حقوق)، وہ طاقت یا امتیاز جو کسی فرد یا جماعت کے لائق ہوتا ہے (مثلاً حقوق

طبیعی) ایسی طاقت یا امتیازی صفت جو کسی قانون یا عرف کے مطابق مقرر ہو۔ لفظ حق کا اصطلاحی اعتبار سے معاشرتی نظام کی حفاظت کے لئے مقرر یا شناختہ شدہ رسوم اور قانون و قواعد کے مجموعے پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔[1]

اسلامی احادیث میں اپنے ایمانی بھائی پر مومن کے حقوق کو نہایت اہم اور گرانقدر بتایا گیا ہے اور اس کا دائرہ قرابت داری اور رشتہ تعلیم وغیرہ سے کہیں زیادہ وسیع بتایا گیا ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے گرانقدر "رسالہ حقوق" میں ایسے حقوق کی نشاندہی کی ہے جو ایک مومن بھائی کو دوسرے مومن بھائی پر حاصل ہوتے ہیں اور جن کو ملحوظ خاطر رکھنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ محدثین نے اس رسالہ کو نقل کیا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ "اللہ تبارک وتعالیٰ کے سب سے بڑے حقوق میں وہ ہے جس کو واجب قرار دیا گیا اور جو تمام حقوق کی اصل اور بنیاد ہے یعنی جملہ انفرادی اور اجتماعی حقوق "حق اللہ" سے جڑے ہوئے ہیں کیونکہ انسان اگر اپنے خالق و پروردگار کے سامنے خود کو مسئول و جوابدہ نہ سمجھے تو پھر اس میں ایسا کوئی محرک نہیں رہ جاتا جو اسے دوسرے تمام حقوق کی ادائگی کی طرف راغب کر سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے سماجی فرائض کو الٰہی افکار اور ایمان و اعتقاد کی بنیاد پر ہرگز انجام نہ دے گا۔

سر دست اس مقالے میں مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کے اقوال و ارشادات کی روشنی میں عوام اور حکومت کے باہمی حقوق کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا مقصود ہے۔ حضرت امیر المومنین نے اپنے دو خطبوں میں حاکم اور رعایا کے آپسی حقوق کا ذکر کیا ہے اور اسے حق خداوندی کے بعد سب سے بڑا حق قرار دیا ہے۔ مولائے کائنات کی نظر میں حکومت کی اتنی بڑی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ خود اسلامی حاکم منتخب اور منصوص ہے اور جملہ اصحاب کا اتفاق ہے کہ وہ غیر معمولی عقل و دانش اور حکمت الٰہی سے مالا مال رہا ہے اور اس کی زبان حقیقی اسلام کی ترجمان اور خالص اسلام ہے اور اس کے اقوال اس کے کردار کے آئینہ دار ہیں یعنی وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر خود بھی عمل کرتا ہے۔

مولائے متقیان نے اپنے جس خطبے میں حاکم اور رعایا کے حق کی وضاحت کی ہے وہ خطبہ نمبر ۲۱۶ ہے جو آپ نے صفین میں ارشاد فرمایا تھا جو پروفیسر جعفر شہیدی صاحب کی گرانقدر تالیف یعنی

''ترجمہ نہج البلاغہ'' میں محفوظ ہے اور مطلوبہ حصے کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

''امابعد، بیشک خداوند عالم نے جب تم لوگوں پر حکمرانی کا کام میرے سپرد کیا تو اس نے تم لوگوں پر میرا حق بھی رکھا اور تم لوگوں کو بھی مجھ پر حق عطا کیا۔ جس طرح حاکم کی حیثیت سے تم لوگوں کی گردن پر میرا حق ہے بالکل اسی طرح تم لوگوں کا حق میرے اوپر بھی ہے۔ پس اگر بیان کیا جائے تو یہ حق بہت وسیع ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ایسا کوئی نہیں جس کی گردن پر کسی کا کوئی

> اگر کوئی ایسا ہے جس پر کسی کا حق نہیں اور وہ دوسروں پر حق رکھتا ہے تو وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود خالق کائنات کی ذات والا صفات ہے کیونکہ اس کو بندوں پر قدرت و توانائی حاصل ہے اور اس کی عدالت نمایاں اور ہر چیز پر اس کی قضاروا اور اس میں دگرگونی پوری طرح ظاہر ہے۔

حق نہ ہو اور وہ دوسرے پر حق نہ رکھتا ہو۔ اگر اس پر کسی کا حق نہیں تو وہ کسی پر حق نہیں رکھتا ہے اور لیکن خداوند عالم نے بندوں پر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا حق قرار دیا ہے اور اس کی اجرت دوگنا بلکہ کئی گنا رکھی ہے اور عفو و بخشش کے دروازہ سے جو محض اس کی ذات سے وابستہ ہے اور لامحدود عطاو بخشش کے ذریعہ جو صرف اسی کیلئے سرفراز ہے۔

''... جس حق کو خداوند عالم نے سب سے زیادہ اہم حقوق میں قرار دیتے ہوئے واجب بھی قرار دیا ہے وہ رعایا پر حاکم کا اور حاکم پر رعایا کا حق ہے اور خداوند عالم نے دونوں کے حقوق کو واجب قرار دیا ہے۔ خالق کائنات نے ایک دوسرے پر باہمی حقوق کو ان کے درمیان تعلقات کا موجب بنادیا اور یہی روابط ان کے دین کی عظمت و سربلندی کا سبب بن گئے۔ پس رعایا کا حال اس وقت تک اچھا ہو ہی نہیں سکتا جب تک حاکم نیک کردار نہ ہوں اور حکمراں لوگ اس وقت تک نیک کردار نہیں ہو سکتے جب تک رعایا نیک اعمال نہ ہو۔ پس جب رعایا حاکم کا حق ادا کردے اور حاکم رعایا کے حقوق کی طرف متوجہ رہے اور دونوں کے درمیان یہ حقوق وسیع تر ہوتے رہیں تو دین کی نشانیاں ظاہر اور عدل و انصاف

کی فراوانی دکھائی دے گی اور سنت پر جس طرح عمل کیا جانا چاہئے اسی طرح عمل ہونے لگے گا اور اس طرح زمانہ کا کام آراستہ ہو جائیگا اور لوگ حکومتِ کی پائداری کے لئے سرگرم عمل رہیں گے۔ دشمنوں کی لالچ بھری نگاہیں خود بخود بند ہو جائیں گی لیکن اگر حاکم رعایا پر غالب ہو جائے یا حاکم رعایا پر ظلم وستم کرنے لگے تو اختلافات کا بازار گرم ہو جائے گا اور ظلم وجور کی علامتیں دور سے آشکار نظر آئیں گی۔ دین میں غیر معمولی تباہی و بربادی پھیل جائے گی۔ لوگ سنت کی راہ سے منحرف ہو جائیں گے اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگیں گے۔ لوگ احکام خداوندی کو ترک کر دیں گے اور ان کی جان کو مختلف قسم کی بیماریاں لگ جائیں گی....''

مذکورہ ارشادات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خداوند عالم کو جملہ حقوق کا منشا قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ مالک اور عادل ہے اور اپنی حکمت کے ذریعہ اس نے رعایا پر حاکم کا حق معین کرتے ہوئے رعایا کو اس کا مطیع و فرمانبردار بنادیا تاکہ معاشرہ میں نظم وترتیب اور صلح وسلامتی قائم رہے اور حاکم دوسری طرف یہ دھیان رکھے کہ اسے بارگاہ عالیہ الٰہی میں جواب دینا ہے لہٰذا اسے مساوات اور پسماندہ افراد کی حمایت کے ذریعہ عوام کی فلاح واصلاح کی کوشش میں لگے رہنا چاہئے۔ لیکن حق ہمیشہ دو طرفہ ہے اسی وجہ سے مولائے متقیان ارشاد فرماتے ہیں اے لوگو! فقط میرا ہی حق نہیں ہے بلکہ تم لوگوں کا حق میرے اوپر بھی ہے اور اس حق کو بھی خداوند عالم نے معین کیا ہے اور حاکم کو بہر حال یہ حق ادا کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ ایک تلخ حقیقت کی یاد آوری کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ ''فالحق اوسع الاشیاء فی التواصف واضیقھا فی التنلصف۔''[9] جی ہاں! بہت زمانے سے یہی ہو رہا ہے کہ جب حق کے بیان اور اس کی وضاحت کی منزل ہوتی ہے تو مقررین کی تقریر کی وضاحت کا دائرۃ کافی وسیع ہو جاتا ہے لیکن جب کردار اور عمل کی منزل آتی ہے تو وہ دائرۃ تنگ ہو جاتا ہے اور منصف افراد کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت امیر حقوق کے درمیان برابری و مساوات کی بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حاکم پر رعایا اور رعایا پر حاکم کا حق درحقیقت سب سے بڑا حق ہے جس کو خداوند عالم نے واجب قرار دیا ہے کیونکہ معاشرہ کے دنیوی واخروی مفاد و مصالح کا اس سے گہرا تعلق ہے اور ان کی نظر میں یہ

ایسا فریضہ ہے جس کو خداوند عالم نے لوگوں کے درمیان الفت و محبت کا باعث قرار دیا ہے اور دین کی عظمت و سربلندی کو بھی اسی میں مضمر و پوشیدہ رکھا ہے لیکن یہ نتیجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب حکومت اور عوام دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی بھرپور رعایت کرتے ہوں۔ اس سلسلے میں نہایت منصفانہ اور نقل کرنے لائق جملہ ملاحظہ ہو۔ "فلیست تصلح الرعیّة الا صلاح الولاة ولا تصلح الولاه الا باستقامة الرعیه"۔ وہ حقیقی پیشوا جو حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا ہے وہ سب سے پہلے حکمرانوں اور گورنروں کی اصلاح و درست کاری کی بات کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ بافضیلت طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اعمال و اقوال پر عوام نگاہ رکھتے ہیں اور خواہ مخواہ لوگ بڑے طبقے کے لوگوں کو نمونۂ عمل بنالیا کرتے ہیں پس اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو رعایا کی بھلائی و نیکوکاری حکمراں طبقے کے لوگوں کی نیک چلنی اور صالح اعمال سے وابستہ ہے لیکن حکمراں طبقے کے لوگ بھی اس وقت تک صالح و نیک کردار نہیں ہو سکتے جب تک کہ لوگ الٰہی احکام و ارشاد پر مبنی ان کے حکم کی باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری نہ کرتے ہوں اور ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود لوگ حق، قانون اور حکم خداوندی پر ثابت قدم نہ رہتے ہوں۔

جب حاکم اور رعایا باہمی حقوق ادا کردیں گے تو پھر ان کے معاشرہ میں حق کی قدر و قیمت میں فطری طور پر اضافہ ہو جائے گا اور دینداری کی راہیں نمایاں اور ان پر گامزن لوگوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح عدل و انصاف کا بول بالا دکھائی دینے لگے گا اور تمام امور و معاملات درست ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو اختلافات کا بازار گرم ہو جائے گا۔ احکام میں ظلم اور دست درازی کی علامتیں نمایاں ہو جائیں گی اور جملہ کام ذاتی اور جماعتی مفاد کی خاطر انجام پانے لگیں گے اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔ ان حالات میں نیک لوگ ذلیل اور کام سے کنارہ کش اور برے لوگ طاقتور اور تمام معاملات پر مسلط ہو جائیں گے۔ پس معاشرہ کی اصلاح حاکم اور عوام کی اصلاح سے وابستہ ہوا کرتی ہے اور دونوں ہی لازمی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حاکم طبقے کے لوگوں کو مقدم قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ان لوگوں کا تعلق سماج کے تعلیم یافتہ اور دانشمند گروہ سے ہوا کرتا ہے اور ان کے اثرات عام لوگوں پر ہوا کرتے ہیں کیونکہ مختلف قسم کی ذمہ داریاں ان کے اختیار میں ہوا کرتی

ہیں اور اسی وجہ سے لوگ ان سے زیادہ توقع بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ مختلف روایات میں اس کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے مثلاً جب لوگ آنحضرت سے عوام الناس کی نیک و فاسد حرکتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو وہ اسے معاشرہ کے خواص سے وابستہ قرار دیتے ہیں اور خواص کے درمیان وہ حکمراں طبقے کا نام لیتے ہیں کیونکہ یہ لوگ خداوند عالم کی مخلوق کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں اور اگر یہ لوگ ظالم ہو جائیں اور احکام میں ظلم اور دروغ گوئی سے کام لینے لگیں تو سماج یقیناً فاسد ہو جائے گا۔[۱۱]

بہر حال اس پیکر عدالت نے کلام الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے حاکم اور عوام کی خوبیوں اور خرابیوں کو بخوبی واضح کر دیا اور اس کے بعد اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''پس تم لوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ اس سلسلے میں ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہو اور آپسی تعاون کا جو حق ہے اسے بخوبی ادا کرتے رہو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ خداوند عالم کی اطاعت و بندگی کا جو

> **خداوند عالم کی اطاعت و بندگی کا جو حق ہے وہ کوئی بھی شخص ادا نہیں کر سکتا چاہے وہ اپنے معبود کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کتنا ہی حریص کیوں نہ ہو اور بندگی کی راہ میں زیادہ سے زیادہ کوشش کیوں نہ کرتا ہو۔**

حق ہے وہ کوئی بھی شخص ادا نہیں کر سکتا چاہے وہ اپنے معبود کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کتنا ہی حریص کیوں نہ ہو اور بندگی کی راہ میں زیادہ سے زیادہ کوشش کیوں نہ کرتا ہو۔ لیکن بندوں پر خداوند عالم کو جو حقوق حاصل ہیں ان میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنا اور اپنے درمیان حق کو قائم رکھنے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی شامل ہے۔ دنیا کا کوئی بھی انسان، چاہے وہ کتنی ہی عظمت و فضیلت کا حامل کیوں نہ ہو، اس بات سے ہرگز بے نیاز نہ سمجھے اور آنکھیں اسے بے قیمت کیوں نہ سمجھتی ہوں، وہ اس سے زیادہ چھوٹا نہیں ہے جو حق کی انجام دہی میں کسی شخص کی مدد کرے یا کوئی دوسرا شخص اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔''[۱۲]

اس حصے میں مولائے متقیان دو ایسے سماجی سیاسی موضوعات پر زور دیتے ہیں جو سماج و معاشرہ کی حفاظت اور سلامتی کیلئے بے حد لازمی ہیں اور دونوں کا تعلق بندوں پر الٰہی حقوق سے ہے۔ پہلا موضوع نصیحت یعنی برادران ایمانی کی خیر خواہی اور دوسرا موضوع تعاون یعنی ایک دوسرے کی امداد سے مربوط ہے اور وہ مدد و امداد بھی سماج میں حق قائم کرنے کیلئے ہے۔ اس کے بعد وہ تاکید فرماتے ہیں کہ کوئی شخص مذہبی اعتبار سے کتنا ہی بافضیلت اور پیرو حق کیوں نہ ہو، حق کے قیام میں دوسروں کی مدد کرنے سے بے نیاز نہیں ہے یعنی حق کے قیام میں اسے دوسروں کی مدد بہر حال کرنی ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی شخص بظاہر کتنا ہی چھوٹا اور حقیر و ناچیز کیوں نہ ہو، حق کی پیروی و قیام میں دوسروں کی مدد کرنے یا دوسروں سے مدد حاصل کرنے میں ناتواں نہیں ہے۔ پس یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں سبھی لوگوں کو نصیحت اور دوسروں سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

نہج البلاغہ میں حکومت اور رعایا کے باہمی حقوق کے سلسلے میں خطبہ نمبر ۳۴ کے آخری حصہ میں ایک نیا موقف دکھائی دیتا ہے۔ اپنی اس تقریر کے ابتدائی مرحلہ میں وہ لشکر معاویہ کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی سے روگردانی کرنے والی فوج کی نافرمانی پر اپنی ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اس تقریر کے آخری حصے میں وہ ایک الٰہی حاکم کی حیثیت سے لوگوں سے یوں خطاب فرماتے ہیں۔

''اے لوگو! مجھے تم لوگوں پر ایک حق حاصل ہے اور تم لوگوں کو میرے اوپر بھی ایک حق ہے اور میرے اوپر جو حق ہے وہ یہ ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی میں کوئی لاپرواہی نہ کروں اور بیت المال سے تمہارا حق تمہارے حوالے کر دوں۔ تم لوگوں کو تعلیم دوں تاکہ تم نادان نہ رہ جاؤ اور تملوگوں کو لازمی آداب بھی سکھادوں۔ البتہ تم لوگوں پر میرا یہ حق ہے کہ تم نے جو بیعت کی ہے اس پر ثابت قدم رہو اور خفیہ و ظاہر دونوں صورتوں میں خیر خواہی کا حق ادا کرتے رہو۔ جب میں تمہیں آواز دوں فورا آجاؤ اور تم کو جو حکم دوں اسکی اطاعت و فرمانبرداری کرو۔[۱۳]

خطبۂ سابق کی طرح وہ اس خطبے میں بھی حق کو دو طرفہ شمار کرتے ہوئے رعایا اور حاکم دونوں کیلئے تین تین حقوق کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے وہ حاکم پر رعایا کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

۱۔ حاکم کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہو اور ایسی کوئی چیز، جس میں ان لوگوں کی دین و دنیا

کی بھلائی نہ ہو، نہ سوچے، نہ کہے، نہ حکم دے اور نہ عمل کرے۔ یعنی حاکم کا فریضہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے عوام کی دنیوی واخروی بھلائی کو نگاہ میں رکھے۔

۲۔ عوام کے مالی حقوق کو بخوبی ادا کرے بلکہ ملک کے مالی وسائل وذرائع کے اضافہ کی فکر میں لگا رہے تاکہ کام میں ترقی اور آمدنی میں اضافہ کا ذریعہ فراہم ہو سکے اور تنگ دست ومفلس افراد تنگی اور مالی پریشانی ومفلوک الحالی سے نجات حاصل کر سکیں۔

۳۔ حاکم کو چاہئے کہ وہ اپنی مملکت میں دینی تعلیمات اور اسلامی آداب کی ترویج کرے اور وہ اسباب وعوامل فراہم کرے جس سے لوگ الٰہی احکام سے آگاہ ہو سکیں۔ اس حق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا نیز انہیں اسلامی ثقافت سے بخوبی واقف وآگاہ رکھنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ یہ بات یقیناً شرمندگی کا باعث ہے کہ اسلامی حکومت کے سایہ میں ملت اسلامیہ کے درمیان کوئی جاہل رہ جائے یا پڑھے لکھے لوگ قرآن مجید کی تلاوت نہ کر سکیں اور قرآن پڑھنے والے افراد آیات قرآنی کے مفہوم سے ناواقف رہ جائیں۔

اس کے بعد وہ رعایا پر حاکم کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

۱۔ حاکم سے جو وعدہ کیا ہے اس کو بخوبی پورا کرنا یعنی حاکم کی بیعت کے ذریعہ اور موجودہ دور میں ووٹ دے کر جو عہد وپیمان کیا ہے اس کو پورا کرنا۔

۲۔ خفیہ اور ظاہر دونوں صورتوں میں اسلامی حاکم کے سلسلے میں خیر خواہ ہونا رعایا کی ذمہ داری ہے لیکن اس خیر خواہی کے ساتھ ہی ساتھ محبت آمیز انداز میں تعمیری تنقید اور رشد وہدایت جیسے امور سے باز نہ رہنا چاہئے۔ رعایا پر حاکم کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

۳۔ فتنہ انگیزوں، فساد پیدا کرنے والوں اور دشمنوں کی نابودی اور صلح وسلامتی نیز تعمیر وترقی کے لئے حاکم کی اطاعت وفرمانبرداری رعایا کا بنیادی فریضہ ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حکمراں طبقے کے اس حق کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے سماجی نظام میں گڑبڑی پیدا ہو جائے گی اور عمومی بدعوانی پھیل جائے گی اور سبھی لوگوں کو دنیوی اور دینی نقصانات کا بوجھ اٹھانا پڑے ہوگا۔

درحقیقت امام علی علیہ السلام کے حکیمانہ ارشادات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے

البتہ فقط لفظ ''نصیحت'' کی وضاحت لازمی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک لمبی مدت گزر جانے کیوجہ سے اس لفظ کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا مفہوم غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور پر ہم لوگ نصیحت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ نوجوانوں کو اچھی باتوں کی طرف راغب کرنے والی باتیں۔ لیکن اس خطبے سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مولائے متقیان نے اس لفظ کو تمام لوگوں یعنی حکمرانوں اور عوام الناس دونوں کے لئے استعمال کیا ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ حکمراں طبقے پر عوام کو عوام پر حکمراں طبقے کو نصیحت کا ایسا حق حاصل ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی و مفہوم کی وضاحت کے لئے ذیل میں کچھ احادیث نقل کی جاتی ہیں جن کی روشنی میں بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

ابن منظور ''مادۂ نصح'' کے ذیل میں لکھتا ہے'' نصح الشئی خلص''(خالص ہو گئی)الناصح کا مطلب ہے''الخالص من العسل''[۱۳] وغیرہ۔ اس لفظ کے مصدری معنی و مفہوم کو بیان کرنے کے بعد ابن اثیر کے مندرجہ ذیل قول کو بطور حوالہ نقل کرتا ہے۔''النصیحة کلمة یعبر بها عن جملة هی ارادة الخیر للمنصوح له ۔ فلیس یمکن ان یعبر عن هذا المعنی بکلمة واحدة تجمع معناها غیر ها واصل النصح ؛ الخلوص ۔''[۱۴] یعنی نصیحت کا معنی مفہوم ہے جس کو نصیحت کی جاتی ہے اس کے بارے میں نیک ارادہ رکھنا اور اس مفہوم کو لفظ نصیحت کے ذریعہ ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ پس نصیحت میں ہمیشہ مرد مقابل یعنی عام مسلمانوں کی بھلائی اور خیر خواہی کو نگاہ میں رکھنا چاہئے اس میں کسی شخص واحد کی انفرادی یا کسی گروہ کی جماعتی خیر خواہی مقصود نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس سے مراد تمام امت مسلمہ ہے۔ اس معنی و مفہوم کی حامل متعدد احادیث موجود ہیں لیکن ذیل میں فقط دو احادیث نقل کی جاتی ہیں تاکہ بات کو پوری طرح واضح کیا جاسکے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم مسلمانوں میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اپنے بھائی کے حق میں ویسی ہی خیر خواہی کرے جیسے وہ اپنی خیر خواہی کرتا ہے۔[۱۵]

علامہ مجلسی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے مومن کے حق میں مومن کی نصیحت کے

سلسلے میں بیان کرتے ہیں کہ نصیحت سے مراد ہے اس شخص کے دینی و دنیوی مفاد و مصالح کے سلسلے میں اس کی ھدایت نیز اگر وہ نادان ہو تو اس کی تعلیم و تربیت، اگر ناواقف ہو تو اس کی آگاہی کا سامان فراہم کرنا، اگر کمزور ہے تو اس کی عزت و آبرو کا دفاع کرنا، اس کا احترام کرنا، اس کے بارے میں حسد نہ رکھنا، تمام نقصانات کو اس سے دور رکھنا اور اس کو ہر طرح کا فائدہ پہونچانا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک مرد مومن پر واجب ہے کہ وہ اپنے دوسرے مومن بھائی کی نصیحت و خیر خواہی کرے۔[16]

مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ اگر سبھی لوگ یعنی حاکم و رعایا آپس میں حقوق الٰہی کو نگاہ میں رکھیں اور ایک دوسرے کا حق ادا کرتے ہوئے باہمی خیر خواہی سے کام لیں تو آج اسلامی معاشرہ میں جو فتنہ انگیزی اور کینہ پروری دکھائی دیتی ہے وہ اتحاد اور ہمدلی و خیر خواہی میں بدل جائے گی اور ایک خداپسند معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

حوالے:

۱۔ایک مثل کہی جاتی ہے جس کا مفہوم جو غلبہ حاصل کرلے حق اسی کا ہے

۲۔منتھی الارب فی لغۃ العرب، عبدالرحیم صفی پور

۳۔ لسان التنزیل، مولف نامعلوم، مطبوعہ بہ اہتمام دکتر مہدی محقق

۴۔لسان العرب، ابن منظور

۵۔ لغت نامۂ دھخدا

۶۔ دائرۃ المعارف فارسی بہ سرپرستی ڈاکٹر غلام حسین مصاحب جلد اول۔ ۸۵۶، ۸۵۷

۷۔اس گرانقدر رسالے کے متن و ترجمہ کے لئے ملاحظہ کیجئے کتاب "زندگانی علی ابن الحسین علیہ السلام" مولفہ ڈاکٹر جعفر شہیدی

۸۔ پورے خطبے کا مطالعہ کرنے کے لئے ملاحظہ کیجئے "ترجمہ نہج البلاغہ از ڈاکٹر جعفر شہیدی ص ۲۴۸۔۲۵۰

۹۔ابن میثم نے نہج البلاغہ پر لکھی گئی اپنی شرح میں اقوال و ارشادات علوی کی بلاغی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے شرح نہج البلاغہ ابن میثم ترجمۂ حبیب روحانی مطبوعہ بنیاد پژوھش ھای اسلامی جلد ۴۔۔۸۷

۱۰۔اس سلسلے میں امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب نقل کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے بعض روحانی

جماعتوں کے درمیان نظریاتی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے مسئلہ کا حل دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ جایئے سب لوگ مل جل کر خدا کے لئے کام کیجئے یہ اختلاف نفسانیت کی دین ہے۔ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو بھی ان کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہ ہوگا کیونکہ ان لوگوں کا مقصد ایک ہے اور وہ مقصد خدا ہے۔

۱۱۔ حضرت علی علیہ السلام سے عامہ مردم کے حالات کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت نے معاشرہ میں رائج فساد اور بے سروسامانی کے لئے معاشرہ کے طبقۂ خواص کو ذمہ دار قرار دیا۔ اس کے بعد معاشرہ کی پانچ جماعتوں کو طبقہ خواص میں شامل کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کے فرائض کا تعین کر دیا کہ ان لوگوں کو یہ الٰہی و سماجی فرائض انجام دینے ہیں۔ علماء اور رہنما خدا کی طرف لیجانے والے ہیں۔ زاہد حضرات خدا کی راہ پر گامزن ہیں، تاجر و سوداگر سماج میں خدا کے امین ہیں، فوجی حضرات دین خدا کے یار و مددگار ہیں اور حکماء حضرات مخلوق خدا کے محافظ و نگہبان ہیں۔ اگر ان پانچ طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے الٰہی و سماجی فرائض کو بخوبی انجام نہ دیا تو معاشرہ میں فساد و تباہی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

۱۲۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۱۶ ص۔ ۲۴۹، فیض الاسلام سید علی نقی کے ترجمہ میں یہ خطبہ ۲۰۷ کی حیثیت سے موجود ہے۔

۱۳۔ راغب نے المفردات فی غریب القرآن میں بھی اس بات کو نقل کیا ہے۔

۱۴۔ الشیخ عباس القمی ، سفینة البحار ومدینه الحکم والاثار ۔ ص ۵۰۸ بقلاز: الکافی جلد ۲ ص۔ ۲۰۸ حدیث۔ ۴

۱۶۔ ایضاً بحوالہ الکافی

☆☆☆☆☆

شاہ مرداں، شیر یزداں، قوت پروردگار

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

از: پروفیسر نثار احمد فاروقی

☆ پروفیسر نثار احمد فاروقی موجودہ صدی کے ہندستان کی نامور علمی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کو اردو، عربی، فارسی اور اسلامیات پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ اپنے احباب کے درمیان یہ علامہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف کا یہ مضمون روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو میں ۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ (یوم شہادت حضرت علی علیہ السلام کے موقع پر) شائع ہو چکا ہے لیکن مقالہ کی عالمانہ حیثیت اور افادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اسے اس شمارہ میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

ماہ رمضان کی اکیسویں تاریخ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا یوم شہادت ہے۔ شہادت موت کی طرح فنائے تام نہیں، بقائے دوام ہے۔ یہ شام و سحر اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر زندۂ جاوید ہو جانا ہے۔ خود قرآن کریم اس کی گواہی واضح لفظوں میں دے رہا ہے: "جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، البتہ تم (اپنے ظاہری حواس سے) اس کا ادراک نہیں کر سکتے" (۱۵۴ر ۲) ہمارا ناقص اور محدود علم یہ کہتا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے رزق بھی ضروری ہے، تو اللہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ شہیدوں کو اپنے رب کے پاس سے رزق ملتا ہے (۱۶۹ر ۳)۔ حضرت علی ابن ابی طالب تاریخ اسلام کی ایسی ممتاز، محبوب، محترم۔ عظیم اور زندہ جاوید شخصیت ہیں کہ شہادت یعنی زندگی جاوید ان کے گھر کی کنیز ہے۔ یہ ان کا اور ان کے خاندان کا خون ہی تو ہے جو دین اسلام کی رگ و پے میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ یہ رنگینی، یہ لالہ کاری، یہ آب و تاب، یہ قوت اور حرارت اسلام کو کہاں سے ملی ہے؟ یہ حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیت کا صدقہ ہے۔ ان میں سے جس کی طرف بھی نظر اٹھایئے غلام ہمدانی مصحفی امروہوی کا شعر یاد آتا ہے۔

خونین کفن شہید الفت
دولہا سجا ہوا کھڑا ہے!

حضرت علیؑ کتنے ناموں سے پکارے جاتے ہیں ابوالحسن، ابوتراب (یہ دونوں لقب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطا فرمائے تھے۔ خود حضرت علیؑ کو اپنا لقب ابوتراب پسند تھا، اگر کوئی اس لقب سے خطاب کرتا تھا تو آپ خوش ہوتے تھے۔) علی مرتضیٰ، اسد اللہ، شیر خدا، مشکل کشا، خیبر شکن، حیدر کرار، یہ سب انہیں کی شانیں ہیں، جو قرآن کریم میں بھی کہیں اعلانیہ بیان ہوئی ہیں اور کہیں ستر پردوں میں بھی نہیں چھپ رہی ہیں۔ احادیث نبوی کا کوئی بھی مجموعہ ایسا نہیں جس میں حضرت علیؑ کے فضائل کی روایات نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہیں یہ اعلان فرماتے ہیں کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ جس کا میں آقا ہوں علی بھی اس کے آقا ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں: اے اللہ جو علیؑ سے محبت کرے تو بھی اس کو دوست رکھیو۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے" انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" میں علم کا شہر ہوں، علی اس کا دروازہ ہیں (ترمذی، الطبرانی، المستدرک) اب ہمارے زمانے میں تو شہر کے دروازے کا تصور ہی نہیں رہا، ابھی پرانی دہلی میں دو ایک دروازوں کے آثار باقی ہیں۔ جب شہر پناہ ہوا کرتی تھی اس کے دروازے دن چھپے بند کر دئے جاتے تھے، پھر شہر میں کوئی بھی کسی طرح داخل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک وہ دروازہ نہ کھلے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ علم ہیں تو ان تک پہنچنے کا ذریعہ حضرت علیؑ ہیں۔ خدا علیم مطلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

حضرت علی ابن ابی طالب تاریخ اسلام کی ایسی ممتاز، محبوب، محترم۔ عظیم اور زندہ جاوید شخصیت ہیں کہ شہادت یعنی زندگی جاوید ان کے گھر کی کنیز ہے۔ یہ ان کا اور ان کے خاندان کا خون ہی تو ہے جو دین اسلام کی رگ وپے میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔

نے ہمیں اس کی ذات و صفات سے آگاہ کیا، اس تک پہنچایا ہے، حضرت علیؑ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں، تو یوں یہ سلسلہ آگے تک پہنچا ہوا ہے۔

حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب کثیر ہیں، اسی لئے ان کے رتبے کو سمجھنا آسان نہیں۔ ایک طرف نصیری فرقہ علیؑ کو خدا بنا کر پیش کرتا ہے تو دوسری جانب ایسے بد بخت بھی ہیں جو ان کے اسلام میں بھی شک کرتے ہیں۔ تاریخ انسانیت میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی کہ ایک ہی شخصیت کے بارے میں اختلاف رائے اس حد تک ہو۔

حضرت علیؑ کے مناقب و فضائل کچھ تو وہ ہیں جو دن کی روشنی سے زیادہ واضح ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا جناب ابو طالب کے فرزند ہیں۔ وہ رسول اللہ کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ کے شوہر اور امام الشہداء حضرت حسینؑ کے والد ماجد ہیں۔ اس پر اجماع امت ہے کہ وہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ مختلف روایات میں اسلام قبول کرتے وقت آپ کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال اور کم سے کم سات سال بیان کی گئی ہے۔ ابو یعلی نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ "بعثت پیر کے دن ہوئی اور میں نے منگل کو اسلام قبول کر لیا تھا۔" زید بن ارقم، جن کے گھر میں ابتدائی زمانے میں مسلمان چھپ کر عبادت کیا کرتے تھے ' کا بیان ہے کہ سب سے پہلے علیؑ نے نماز پڑھی تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ علیؑ نے کبھی کسی بت کی پوجا قطعاً نہیں کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ہوا تو انہوں نے حضرت علیؑ ہی کو اپنے بستر میں سلا کر مدینے کی طرف ہجرت کی تھی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھی ہوئی اہل مکہ کی ساری امانتیں واپس کرنے کے بعد تیسرے دن مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ حضرت علیؑ تمام غزوات میں شریک رہے، وہ مسلمانوں کا جھنڈا لے کر آگے آگے چلتے تھے، اور ہر معرکے میں اپنی جان پر کھیل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیبؒ کا بیان ہے کہ جنگ احد میں علیؑ کے جسم پر سولہ زخم آئے تھے، اس کے باوجود وہ ثابت قدم رہے۔ شہیدوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور انہیں دفن کرتے تھے۔ صرف غزوۂ تبوک میں وہ شریک نہیں تھے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینے میں اپنے گھر اور اہل و عیال کی خبر گیری اور حفاظت کے لئے اپنا نائب بنا کر

چھوڑا تھا۔ اس پر بعض ستم ظریفوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ رسول اللہ نے ضرور کوئی بات ناپسند کی ہے اس لئے علیؑ کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ حضرت علیؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ مجھے کیوں چھوڑے جاتے ہیں؟ فرمان رسالت ہوا: "اے علی! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہارا وہی رتبہ ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کا تھا بس اتنا ہے کہ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ یعنی اگر سلسلہ نبوت منقطع نہ ہوا ہوتا تو تم نبی بھی ہوتے۔ بخاری و ترمذی نے حضرت سعد بن وقاصؓ سے یہ روایت اخذ کی ہے۔ ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علی منی وانا من علی" (میں علی سے ہوں اور علی مجھ سے ہیں) حضرت عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا: انت اخی فی الدنیا والاخرۃ (تم دین اور دنیا دونوں میں میرے بھائی ہو) حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: علی کی تین خصوصیات ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے نصیب ہو جاتی تو میں اسے سرخ اونٹوں کے انعام سے زیادہ پسند کرتا۔ کسی نے پوچھا وہ کونسی خصوصیات ہیں؟ فرمایا: ایک تو یہ کہ وہ حضرت فاطمہ کے شوہر ہیں، دوسرے ان کا گھر مسجد نبوی کے اندر ہے، تیسرے یہ کہ غزوۂ خیبر میں وہ علم اٹھائے ہوئے تھے" (مسند احمد بن حنبل) جب شام میں حضرت جعفر طیار کی شہادت ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر علی کو کہیں کسی مہم یا کسی کام کے لئے روانہ کرتے تھے تو دعا مانگتے تھے، "یا اللہ مجھے تنہا نہ چھوڑیو تو ہی سب سے اچھا وارث ہے" (۸۹/۲۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ظاہری علوم دنیا کو دیئے تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ ان سب علوم کے ترجمان علی ہی تھے۔ قرآن تو ان کے گھر میں نازل ہوا تھا اور جبریل علیہ السلام ان کی آنکھوں کے سامنے آتے تھے، اسی لئے جب کوئی مقدمہ ان کے سامنے پیش آیا تو انہوں نے وہی فیصلہ دیا جو روح اسلام کے عین مطابق ہوا۔ جسٹس امیر علی نے صحیح لکھا ہے۔ "رسول اللہؐ کی جو تعلیمات بچپن ہی سے علی کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئی تھیں ان کے ثمرات آگے چل کر ان کے خطبات و مواعظ میں نظر آ رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں ابتدائی دور میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علیؑ کی شخصیات ہی ایسی ہیں جو عربی گرامر، لغت، تاریخ، انسانیت، ریاضی، ہندسہ وغیرہ علوم میں بھی

دلچسپی لیتی نظر آتی ہیں۔ فقہ اور قانون میں حضرت علیؓ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے احکام شرعیہ کو عقلی تاویلات کی روشنی میں بھی پرکھا ہے۔ حضرت علیؓ سے ۵۸۶ احادیث مروی ہیں۔ ان سے روایت کرنیوالوں میں محمد بن الحنفیہ، حسن و حسین، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، ابو موسیٰ اشعری، ابوہریرہؓ عنہم اجمعین جیسے ممتاز اصحاب کرام شامل ہیں۔

دوسرا پہلو یعنی اسلام کا روحانی پہلو، اسلامی تعلیمات کے رموز، ان کی روح اور روحانیت کو بھی حضرت علیؓ نے اپنے اعمال و اقوال سے شائع کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ تصوف اسلامی کے جتنے سلسلے رائج ہیں، نقشبندی طریقے کو چھوڑ کر ان سب کا مصدر اور مرجع بھی حضرت علیؓ ہی کی ذات گرامی ہے۔

جب یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے ہاتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ پر چڑھائی کی تھی، جس کا تذکرہ قرآن کی سورہ الفیل میں ہے، اس حادثے کے تیس برس بعد ۱۳ رجب کو حضرت علیؓ کی ولادت ہوئی تھی، جتنی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پائی یعنی ۶۳ سال اتنی ہی عمر میں آپ نے خلعت شہادت پہنا۔ ایک ازلی بدنصیب اور شقی انسان نے ۱۹ رمضان ۴۰ھ کو فجر کی نماز سے پہلے کوفے کی مسجد میں چھپ کر زہر آلود خنجر سے آپ پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں آپ ۲۱ رمضان کو اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ یہ وہ شب تھی جسے قرآن نے ہزار مہینوں سے بہتر کہا ہے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت حسنینؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور خوارج کے ڈر سے نہایت رازداری کے ساتھ انہیں کوفہ کے دارالامارہ میں دفن کر دیا گیا، بعد میں کسی وقت حضرت حسنؓ نے ان کے تابوت کو مدینہ منورہ میں لاکر دفن کیا۔ اس بارے میں دوسری روایات بھی شائع ہوگئی ہیں۔

حضرت علیؓ کی مدت خلافت چار سال نو ماہ اور تین یوم ہے۔ یہ تاریخ اسلام کا بڑا نازک زمانہ تھا۔ حضرت علیؓ کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے درمیان جنگ نہ ہو، یہ طاقت مجتمع ہو کر بڑھے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں کام آئے، مگر اسی زمانے میں فتنے بھی اسی طرح پھوٹے جیسے برسات میں گھاس اگتی ہے۔ ادھر کوفہ میں جو حضرت علیؓ کا دارالخلافہ تھا ان کی فوج کا وہ حال تھا جو نہج البلاغہ کے ایک خط سے ظاہر ہے کہ وہ اہل شام سے لڑنے کے لئے فوج بھیجنا چاہتے ہیں مگر فوجی ٹال مٹول کر رہے

ہیں۔ آخر یہ خبر ملتی ہے کہ شامی فوج انبار کے علاقے میں گھس آئی اور وہاں کی چوکی کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ یہ خبر پا کر حضرت علیؑ نے ایک خط لکھا اور حکم دیا کہ نماز جمعہ کے بعد کوفے کی مسجد میں پڑھ کر سنا دیا جائے۔ اس خط کے ایک ایک لفظ میں جو تاثیر اور کرب ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، خدا توفیق دے تو محسوس کیا جا سکتا ہے، حضرت علیؑ نے لکھا تھا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، خدا کے بندے علی امیر المومنین کی طرف سے ان کے کوفی حامیوں کے نام۔ سلام علیکم، بے شک جہاد جنت کا دروازہ ہے۔ جس نے جہاد ترک کیا خدا نے اس کو ذلت کی پوشاک پہنا دی اور اس پر پستی مسلط کر دی۔ میں نے اس قوم کے خلاف دعوت جہاد دی، صبح کو بھی شام کو بھی، راز داری سے بھی، کھلے بندوں بھی۔ میں نے تم سے یہ کہا کہ ان لوگوں سے بھڑ جاؤ قبل اس کے کہ وہ تم پر چڑھائی کریں۔ وہ قوم ذلیل ہو جاتی ہے جس کے دشمن اس کے گھر آنگن میں گھس کر لڑیں۔ دیکھو برادر بنو عامر انبار تک آ پہنچا ہے، اس نے ابن حسان البکری کو قتل کر کے تمہاری چوکی کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ دشمن باطل پر ہوتے ہوئے بھی جی جان سے ایک ہیں، تم حق پر ہوتے ہوئے بھی تتر بتر ہو۔ خدا کی قسم تم نے میرا سینہ غم اور غصے سے پر کر دیا ہے، میری ہر سانس کو میرے لئے تلخ ترین گھونٹ بنا دیا ہے اور میری دانش کو خود میری ہی نظر میں پراگندہ کر دیا ہے، قریش کہنے لگے ہیں کہ "علی بن ابی طالب آدمی تو صاحب شجاعت ہے مگر آداب جنگ سے ناواقف ہے۔ میں انہیں ان کے باپ کے نام پر خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا ان میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جس نے جنگ کی سختیاں مجھ سے زیادہ جھیلی ہوں؟ میں نے اس وقت سے جنگ میں حصہ لینا شروع کیا تھا جب میری عمر بیس برس بھی نہ تھی، آج میں ساٹھ سال کا ہوں، بات یہ ہے کہ جس کا حکم نہ مانا جائے اس کی رائے کیا اور دانش کیا؟"

کسی نے حضرت علیؑ سے کہا تھا کہ پہلے خلفاء کے زمانے میں تو اتنا انتشار نہ تھا آپ کے عہد میں ایسا کیوں ہے؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: ان خلفاء کا مشیر میں تھا اور میرے تم لوگ ہو۔"

غرض ایمان میں سبقت ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت یا ان سے قربت اور قرابت، جان و مال کی قربانی اور قناعت یا کتاب و سنت کا گہرا علم و حکمت، جہاد فی سبیل اللہ ہو یا میدان

جنگ میں شجاعت اور استقامت، ورع و تقویٰ ہو یا زہد و عبادت، علم اور عمل میں فضیلت و امتیاز کا کون سا پہلو ایسا ہے جس پر نگاہ کریں اور حضرت علیؑ کی سیرۃ ایک مثال بن کر ہمارے سامنے نہ آئے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے راویوں نے اکثر معمولی کرتے اور چادر اور تہبند میں ملبوس دیکھا ہے، کبھی کرتے میں پیوند بھی ہوتے تھے، کسی نے ٹوکا: امیر المومنین آپ پیوند لگا کر تا کیوں پہنتے ہیں، فرمایا اس سے طبیعت میں انکسار پیدا ہوتا ہے اور یہ دوسرے مسلمانوں کے لئے نمونہ بھی بنتا ہے۔ بازار میں

"جب حضرت علیؑ اس دنیا سے گئے تو ایک تلوار، اور قرآن کریم کا ایک نسخہ ترکے میں چھوڑا تھا۔ صرف سات سو درہم نقد تھے جو عطا کرنے سے رہ گئے تھے، بعض مورخ کہتے ہیں کہ وہ اس رقم سے کوئی غلام خریدنا چاہتے تھے تاکہ اسے آزاد کریں"۔

تشریف لے جاتے ہیں، ایک معمولی کپڑے کا کرتا خریدنا ہے، دکاندار سے پوچھا: مجھے پہچانتے ہو کون ہوں؟ اس نے عرض کیا کیوں نہیں، آپ امیر المومنین علی ابن ابی طالب ہیں! اسے سلام کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور اس دکاندار سے خریدتے ہیں جو انہیں جانتا۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عہد میں بیت المال اکثر خالی رہا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بیت المال میں روپے موجود ہوں اور کوئی ضرورت مند اپنی کسی احتیاج کے لئے پریشان رہے۔ "جب حضرت علیؑ اس دنیا سے گئے تو ایک تلوار، اور قرآن کریم کا ایک نسخہ ترکے میں چھوڑا تھا۔ صرف سات سو درہم نقد تھے جو عطا کرنے سے رہ گئے تھے، بعض مورخ کہتے ہیں کہ وہ اس رقم سے کوئی غلام خریدنا چاہتے تھے تاکہ اسے آزاد کریں"۔

☆☆☆☆☆

عالمی دہشت گردی، صہیونیت اور اسلام

از: ڈاکٹر اختر مہدی

کسی بھی واقعہ کی تفتیش کا عام طریقہ یہ ہوا کرتا ہے کہ مقررہ قوانین کے مطابق حادثہ کا شکار ہونے والے فرد یا ملک سے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کی کسی سے کوئی عداوت یا دشمنی تو نہیں تھی؟ امریکہ پر ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو ہونے والے حملے کے حوالے سے اس سوال کے جواب میں امریکہ کے دشمنوں کی ایک لمبی فہرست دکھائی دینے لگتی ہے۔ ویتنام، جاپان، عراق، ایران، بوسنیا، ہرزیگوینیا، لبنان، شام، لیبیا، سوڈان اور فلسطین وغیرہ وہ ممالک ہیں جن کی امریکہ سے گہری عداوت رہی ہے لیکن خود امریکہ کا یہ دعویٰ ہے کہ ان حوادث کا اصلی ذمہ دار منحرف سعودی شہری اسامہ بن لادن ہے، وہ افغانستان میں چھپا ہوا لہٰذا افغانستان پر خوفناک فوجی حملہ کر کے بن لادن کا کام تمام کر دیا جائے۔ اب تک اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے اور جب تک کسی ملزم پر عائد کیے گئے الزام کی تصدیق نہ ہو جائے یعنی ملزم، مجرم نہ بن جائے دنیا کا کوئی قانون اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتا ہے پھر دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے نام پر افغانستان پر وحشیانہ امریکی بمباری کیوں کی جارہی ہے؟

اب دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بن لادن کون ہے؟ اس کو اتنی بڑی طاقت کہاں سے مل گئی کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس سوال کے جواب میں امریکہ کا نام لے گا لیکن دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے گزشتہ دو دہائیوں کے درمیان

اسلامی دنیا میں رونما ہونے والے حالات وحوادث کا اجمالی تجزیہ لازمی معلوم ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۷۹ء میں سرزمین ایران میں امام خمینی کی قیادت میں کامیابی کی منزلیں طے کرنے رونما والے اسلامی انقلاب میں موجود جاذبیت نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا چونکہ یہ انقلاب ایک عظیم مقصد کے لئے رونما ہوا تھا اس لئے اس کو بڑی سے بڑی قربانیاں بھی پیش کرنی پڑیں۔اس کی اکثر وبیشتر نعمتوں اور برکتوں کا تعلق تو ایران سے تھا لیکن عالمی سطح پر اس نے تین ایسے اہم کارنامے انجام دئے ہیں جو یقیناً ناقابل فراموش ہیں۔پہلا کارنامہ عالمی سطح پر اسلام کا احیاء ہے۔ دوسرا کارنامہ ظالم صہیونی حکومت کے مقابلے میں فلسطین کی بھرپور حمایت اور تیسرا کارنامہ وحدت اسلامی پر مشتمل قرآنی اور الٰہی پیغام کو عملی جامہ پہنانا ہے اور انقلاب اسلامی ایران کے انہیں تین اہم بین الاقوامی پہلوؤں کی وجہ سے ہی امریکی صہیونی طاقت نے یہ پروپگنڈہ شروع کردیا تھا کہ ایران اپنے

> **پاکستانی ایٹمی بم کو اسلامی بم کے نام سے پکارا گیا تاکہ ہندوستانی غیر مسلم عوام کو یہ باور کرا سکیں کہ ان کا دشمن پاکستان نہیں بلکہ اسلام ہے اور اس طرح صدیوں سے باہمی احترام وتعاون کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائیں**

انقلاب کو ساری دنیا میں ایکسپورٹ کرنا چاہتا ہے،دنیای اسلام کو اس انقلاب سے دور رکھنے کے لئے یہ کہا گیا کہ یہ شیعہ انقلاب ہے تاکہ غیر شیعہ برادرن اسلام جن کی اکثریت ہے،اس انقلاب سے بیزار ہو جائیں۔اس کے بعد ایران پر خوفناک وتباہ کن جنگ کا بوجھ لادیا جاتا ہے تاکہ وہ فلسطینی مظلومین کی حمایت نہ کرسکے۔ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے کہ پاکستانی مسلمانوں نے ۱۹۸۰ کی دہائی کے دوران آیت اللہ سید علی خامنہ ای کا ایسا شاندار استقبال کیا تھا کہ ساری دنیا حیران ہو گئی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ امریکی اور یہودی طاقتوں نے پاکستان کو ہی سنی شیعہ اختلاف کا ایسا مرکز بنادیا کہ رمضان المبارک کے

مہینے میں ایک جماعت کے اسلحہ بردار اور نام نہاد مجاہدوں نے مسجد میں دوسری جماعت کے روزہ دار مسلمانوں کو نماز کی حالت میں گولیوں سے بھون ڈالا اور اپنی خام خیالی میں خود ساختہ جنت کے حقدار بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی ایٹمی بم کو اسلامی بم کے نام سے پکارا گیا تاکہ ہندوستانی غیر مسلم عوام کو یہ باور کرا سکیں کہ ان کا دشمن پاکستان نہیں بلکہ اسلام ہے اور اس طرح صدیوں سے باہمی احترام وتعاون کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائیں اور صرف حکومت ہند ہی نہیں بلکہ غیر مسلم ہندوستانی عوام ہر مسلمان میں طالبان اور بن لادن کی جھلک محسوس کرنے لگیں۔ حکومت طالبان کے ذریعہ افغانستان میں محفوظ گوتم بدھ کے ہزاروں سال پرانے مجسموں کو چکنا چور کروانے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ دنیا کے مختلف ملکوں اور علاقوں میں پھیلے ہوئے بودھ مذہب کی پیروی کرنے والے لوگ اسلام سے نفرت کرنے لگیں اور برصغیر ہند میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی عداوت میں امریکہ اور یہودیت کے درمیان ہمیشہ سے غیر معمولی اتحاد رہا ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کے قلب یعنی فلسطین میں اسرائیل کی تشکیل کا منصوبہ بنایا گیا تھا ورنہ امریکہ، سابقہ سوویت یونین اور جرمنی ولندن میں یہودیوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی اور ان ملکوں میں سے کسی ایک علاقہ میں ملک اسرائیل کی تشکیل کی جا سکتی تھی لیکن یہودیت اور عیسائیت کی ملی بھگت کے نتیجے میں فلسطین میں اسرائیل نامی ملک کی تشکیل کا کام انجام دیا گیا جس کا بنیادی مقصد اسلام اور مسلمانوں کی نابودی تھا اور اسرائیل کے حکمراں بار بار اس مقصد کی وضاحت کرتے رہے ہیں۔ کبھی دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان واقع اسلامی علاقوں کو اسرائیلی سرزمین بتا کر کبھی تشدد اور دہشت گردی کو اسلام اور مسلمانوں سے جوڑ کر اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

جی ہاں! ۱۱ر ستمبر کو امریکہ میں رونما ہونے والے انسانیت سوز حوادث سے اسلام اور مسلمانوں کو وابستہ کرنے کا بنیادی مقصد اسلام اور مسلمانوں کی ذلت ورسوائی اور نابودی ہے اور اس سازش میں امریکہ اور صہیونیت دونوں ملوث ہیں۔ دونوں کی باہمی سرمایہ کاری سے اسلام محمدیؐ کے

مقابلے میں امریکی اسلام کی ایجاد عمل میں آئی۔ جس سرزمین میں حقیقی اسلام کا ظہور ہوا تھا وہاں سے بن لادن کو منتخب کیا گیا اس کے علاوہ مسلمان نوجوانوں کی مختلف جماعتوں کو اسلام دشمن خفیہ تنظیم نے مختلف کیمپوں میں فوجی تربیت دی تاکہ انقلاب اسلامی ایران کے سایہ میں عالمی سطح پر جو اسلامی بیداری پیدا ہو گئی ہے اور دنیا کی دیگر اقوام کے درمیان اسلام کو جو مقبولیت حاصل ہو گئی ہے وہ پوری طرح نابود ہو جائے۔ اب یہ اور بات ہے کہ جس بوتل میں امریکی اور صہیونی ماہرین بن لادن اور جماعت طالبان کی پرورش کر رہے تھے وہ ٹوٹ گئی اور امریکی آغوش کے پروردہ ان مسلمانوں کو اسلام سے حقیقی محبت پیدا ہو گئی اسی وجہ سے امریکہ اور صہیونیت دونوں نے بن لادن اور طالبان دونوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے بظاہر ان کے خلاف لیکن در حقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی جنگ چھیڑ دی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واشنگٹن اور نیویارک میں رونما ہونے والے ان واقعات میں گزشتہ دو دہائی کے دوران جنگ و نبرد آزمائی اور قتل و غارتگری کے خوفناک شعلوں میں جھلسے ہوئے ان افغانی مسلمانوں کا کیا قصور ہے جن پر آج بھی امریکہ بمباری کر رہا ہے؟ اور اس خوفناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے افغانستان کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہو کہ ایران کے پڑوسی ملک کی حیثیت سے افغانستان اسلامی انقلاب سے غیر معمولی طور پر متاثر رہا ہے اسی وجہ سے پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس سازش میں لپیٹا جا رہا ہے اور حکومت ہند کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ خدانخواستہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے اور سارے ہندوستانی مسلمان دہشت گرد ہیں!! جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صہیونی پروپگنڈہ کے بموجب آج جن اسلامی مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ کہا جا رہا ہے اسی درسگاہ کے پروردہ مسلمان آزادی ہند تحریک کے دوران جام شہادت نوش کر کے اپنی وطن دوستی کا ثبوت پہلے ہی فراہم کر چکے ہیں۔

ان اسلام دشمن طاقتوں اور جماعتوں کو اس حقیقت کا اندازہ نہیں ہے کہ اسلام ایک انسانیت دوست الٰہی آفاقی پیغام کا نام ہے جس کو ملکوں اور جغرافیائی سرحدوں کے دائرہ میں ہرگز محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آخر وہ اسلام دہشت گردی کی حمایت و سرپرستی کیسے کر سکتا ہے جس کی مقدس کتاب ایک

بے گناہ شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کرتی ہے اور جس کا خدا فقط مسلمانوں کا رب نہیں بلکہ رب العلمین ہے۔

جی ہاں! دہشت گردی کے ان واقعات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ قطعی مناسب بات نہیں ہے کہ امریکہ مثالی عالمی دہشت گردی کا سرغنہ بن جائے اور بے سہارا افغانی مسلمانوں پر وحشیانہ بمباری کرنے لگے۔ یہ ایک وحشیانہ عمل ہے لہٰذا بمباری کے بجائے امریکہ کو اپنی خارجہ سیاست اور فوجی سرگرمیوں کا محاسبہ کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ جو اسلحہ آج طالبانی فوجیوں کے ہاتھوں میں دکھائی دیتا ہے وہ انہیں امریکہ نے ہی فراہم کیا ہے اور جب تک طالبان کے روپ میں یہ افغانی مسلمان ان اسلحوں کے ذریعہ اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہاتے رہے امریکہ کو دہشت گردی نہیں دکھائی پڑی اور کچھ ہی دنوں بعد پلک جھپکتے ہی یہ مسلمان دہشت گرد بن گئے۔ امریکہ کل یہ غلطی ایران عراق جنگ کے دوران بھی کر چکا ہے۔ سعودی اور کویتی پٹرو ڈالر کے بدلے میں امریکہ نے عراق میں خوفناک اسلحوں کا انبار لگا دیا تھا اور جب دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی کا اعلان ہو گیا تو امریکہ نے ان اسلحوں کی نابودی کے بہانے عراق کے مختلف شہروں پر ایسی بمباری کی کہ پوری دنیائے بشریت لرزہ براندام ہو گئی اور اس بمباری کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی طور پر معذور پیدا ہونے والے عراقی بچے امریکی حکام سے بار بار اپنی زبان بے زبانی میں یہ سوال کر رہے ہیں کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ عراق پر بمباری کا سارا خرچ کویت اور سعودی عرب سے وصول کیا گیا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام امن و سلامتی اور صلح آمیز ہمزیستی کا مذہب ہے۔ اس کو دہشت گردی سے جوڑنا انتہائی ناعاقبت اندیشانہ قدم ہے کیونکہ عیسائیوں کے بعد دنیا میں مسلمانوں کی سب بڑی تعداد آباد ہے اور یہ تعداد جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک گوشے میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور عالمی سطح پر جنگ کی آگ کو بھڑکانا مناسب نہیں ہے۔ امریکہ کو اسلام دشمنی کی عینک ہٹا کر اصل مجرم کی تلاش کرنی چاہئے اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کیونکہ اتنا بڑا مجرمانہ عمل نامور ماہرین کی تکنیکی مدد کے بغیر انجام دینا ناممکن ہے اور کوئی آستین کا سانپ ہی یہ کام انجام دے سکتا ہے۔

افغانستان ہو یا عراق یا دنیا کا کوئی بھی دوسرا ملک بالکل اسی طرح اسلام ہو یا دیگر ادیان

و مذاہب الٰہی یا انسانی اصول و ضوابط پر مبنی حکومتی نظام ہر جگہ یہ بنیادی قانون موجود ہے کہ ظالم کو ظالم اور مظلوم کو مظلوم کہا جائے۔ جس نے جرم کیا ہو اس کو اپنے دفاع کا حق دیا جائے اور جب محکم اسناد و مدارک کی روشنی میں جرم پوری طرح ثابت ہو جائے تو جرم کے تناسب سے مجرم کو سزا دی جائے۔ لیکن علمی ترقی کے موجودہ دور میں صورتحال بالکل مختلف نظر آرہی ہے۔ کویت پر حملہ کر کے جرم کا ارتکاب صدام نے کیا تھا اور سزا عراقی عوام بھگت رہے ہیں۔ جی نہیں تنہا عراقی عوام ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کی فوجوں کی موجودگی سے علاقے میں واقع تمام ممالک کے لوگوں کا دم گھٹ رہا ہے وہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے میں گھبراہٹ محسوس کر رہے ہیں اور دوسری طرف بن لادن کی جستجو کے بہانے افغانی مسلمانوں کی ریش تراشی اور وہاں کی مسلم خواتین کے ہاتھوں برقع سوزی کی نمائش کے ذریعہ اسلامی قدروں کو پامال کیا جارہا ہے۔ شاید اسلام دشمن طاقتوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ نہیں ہے کہ افغانستان ہو یا عراق یہ دونوں اسلامی ممالک ہیں اور ان ملکوں کے اسلامی کردار کو مجروح تو کیا جاسکتا ہے لیکن نابود نہیں کیا جاسکتا ہے اور انشاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ کہ اسلام کا دہشت گردی سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ حقیقت کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ مسلمان کے اسلام کی شناخت کی کوشش نہ کرنی چاہئے بلکہ اسلامی اصول و ضوابط کے ذریعہ مسلمانوں کی شناخت کرنی چاہئے تاکہ حقیقت پوری طرح واضح ہو سکے۔ سردست اجباری آوارہ وطنی کی وجہ سے افغانی پناہ گزین دنیا کے ان شہروں اور علاقوں میں بھی پہونچ گئے ہیں جہاں پہلے کوئی مسلم خانوادہ آباد نہیں تھا۔ یہ افغانی عوام جن میں سن رسیدہ بزرگ بھی شامل ہیں۔ اپنے عبادتی امور مثلاً نماز، روزہ اور حسن اخلاق کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا وسیلہ بھی بن سکتے ہیں کیونکہ خداوند عالم نے قیامت تک اسلام کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اور خدا کی لایزال طاقت کے آگے کسی بڑی طاقت کا زور چلنے والا نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

نئی صبح

ڈاکٹر پیکر جعفری اترولوی

حصار تیرہ شبی جلد ٹوٹ جائے گا
یقین ہے کہ سویرا ضرور آئے گا
بہار آئے گی ہر پھول مسکرائے گا
چمن میں دور خزاں اب نظر نہ آئے گا
مرا امامؑ نئی صبح لے کے آئے گا

اندھیرے دور بہت دور بھاگ جائیں گے
تمام شہر ومضافات جگمگائیں گے
فلک سے حضرت عیسیٰ اتر کے آئیں گے
نقاب چہرۂ روشن سے جب اٹھائے گا
مرا امامؑ نئی صبح لے کے آئے گا

زمانہ نور محمدؐ سے جگمگائے گا
علیؑ کا دور حکومت پلٹ کے آئے گا
حسنؑ کی صلح کا انجام رنگ لائے گا
حسینیت کا اجالا جہاں پہ چھائے گا
مرا امامؑ نئی صبح لے کے آئے گا

نقوش کفر وجہالت مٹائے جائیں گے
چراغ علم وہدایت جلائے جائیں گے
تمام بگڑے مقدر بنائے جائیں گے

یہ اجڑی بستیاں پھر سے وہی بسائے گا
مرا امامؑ نئی صبح لے کے آئے گا

نہ قتل ہوں گے نہ چرچا رہے گا قاتل کا
جہاں سے خاتمہ ہوگا ہر ایک مشکل کا
پتہ ملے گا مسافر کو اپنی منزل کا
پیام امن بھی پیکر وہ ساتھ لائے گا
مرا امامؑ نئی صبح لے کے آئے گا

☆☆☆☆☆☆

غالب کے دور میں فارسی نثر

ایک اجمالی تجزیہ

نکہت فاطمہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی جو ترقی مغلوں کے دور میں ہوئی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مغلوں کی فارسی زبان وادب سے دلبستگی اور تشویق کے نتیجہ میں شعراء علماء وادباء کی ایک کثیر تعداد درباروں سے وابستہ رہی۔ بابر سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک سبھی مغل بادشاہوں نے فارسی زبان وادب کی سرپرستی کی۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ تھے جو فارسی زبان وادب کے دلدادہ تھے۔ غالب (۱۷۹۷ء/ ۱۲۱۲ھ-۱۸۶۹ء/ ۱۲۸۵ھ) اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں انگریز ہندوستان کے مختلف حصوں پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ چونکہ فارسی زبان کی جڑیں ہندوستان میں کافی گہری اور قدیم تھیں۔ اسی وجہ سے فارسی زبان انگریزی زبان سے مغلوب نہیں ہو سکی۔ اس دور میں بھی ہندوستان میں فارسی شعراء وادباء کی خاصی تعداد تھی مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی ثم الدھلوی، مولانا مفتی صدر الدین خان متخلص بہ آزردہ، مولوی عبد اللہ خان علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خان مومن، نواب مصطفیٰ خان حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خان نیر، سید غلام خان وحشت وغیرہ۔ بقول حالیؔ

"در حقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی، نظیری کے حق میں خانخانان ابوالفتح کا ان کے زمانے میں ہونا۔"[1]

غالب کو اپنی ترک نژادی اور فارسی دانی پر ناز تھا۔ وہ اپنے دادا کے ہندوستان آنے کا حال بڑے ذوق کے ساتھ بیان کرتے ہیں مہر نیمروز میں لکھتے ہیں:

" نیای کان که در قلمروی ماوراالنهر سمر قندی...از سمر قند به هند آمد۔"[2]

غالب کو فارسی میں غیر معمولی استعداد حاصل تھی اور انہوں نے اسی زبان کو اپنے اظہار وابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ نہ صرف شاعری میں بلکہ نثر میں بھی جو اہم یادگاریں چھوڑیں وہ ادب کی جان ہیں۔ غالب کو نہ صرف اپنی فارسی شاعری پر بلکہ فارسی نثر کے اسلوب پر بھی ناز تھا اور وہ اپنے فخر کا اظہار مہر نیمروز میں اسی طرح کرتے ہیں۔

" این پارسی آمیختہ بتازی کہ از زبان چیرہ دستی عرب برعجم درگیتی پدید آمد خسروی گنجینہ" دربستہ بود کہ خامہ من قفل درش را کلید آمد پرویز کجا ست تابنگرد کہ درین رھروی کدام رہ سپردہ ام وبھرام کجا است تا فرارسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔"[۳]

غالب کے فارسی نثری آثار سے ان کے عہد کے حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خاص کر غالب کے خطوط سے ہمیں غالب اور ان کے عہد کے بارے میں جاننے اور سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ غالب اس زمانے میں سن شعور کو پہنچے جب ایک طرف تو غیر ملکی ہندوستان میں اپنی طاقتیں بڑھا رہے تھے تو دوسری طرف مغل حکمرانوں کی طاقت اگرچہ زوال پزیر تھی مگر ملک کے مختلف گوشوں میں ان حکمرانوں کی عزت، احترام اور بزرگی قائم تھی۔

۱۸۵۷ء کا غدر غالب کے لئے روح فرسا حادثہ تھا۔ غالب نے اپنے مکاتیب میں ان خونیں حادثات وواقعات کو بہت موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور اسی وجہ سے ان کے خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب کی نثری تصانیف میں خطوط کے علاوہ پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو، کلیات نثر غالب، قاطع برھان، درفش کاویانی وغیرہ شامل ہیں۔

غالب کی فارسی نثری تصانیف ان کی بے مثال تخلیقی صلاحیتوں کا نمونہ ہیں۔ زبان وبیان پر ان کو استادانہ مہارت حاصل تھی۔ فارسی نثر کے بارے میں انہوں وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غالب نے نثر میں سادہ نویسی اپنا کر جدتیں پیدا کیں۔ جہاں ایک طرف انہوں نے خطوط میں لمبے چوڑے القاب سے پرہیز کیا وہیں دوسری طرف عبارت کو آرائش سے پاک کر کے نفس مضمون کو عبارت آرائی سے زیادہ اہمیت دی اور پیچیدہ جملوں سے گریز کیا۔

غالب اپنی مشہور تصنیف پنج آہنگ کے آہنگ اول میں جو کہ القاب و آداب سے متعلق ہے، طرز نگارش سے متعلق اپنے خیالات و نظریات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

" بدان ای هوشمند سخن پیوند که نامه نگار را آن باید که نگارش را از گزارش دور ترنبرده ، بنشش را رنگ گفتن دهد و مطلب را بدان روش گزارد که دریافتن آن دشوار نبود، واگر مطلبی چند داشته باشد در تقدیم و تاخیر ژرف نگهی بکار برد، از آن بپر هیزد که در سخن گره درگره گردد واجزای مدعا بهم دیگر فرو خورد. زنهار استعاره های وقیق ولغات مشکله ونامانوس در عبارت درج نکند ودر هر نوورد رعایت رتبهٔ مکتوب‌الیه در نظر دارد وتاتواند سخن را درازی ندهد واز تکرار الفاظ محترز باشد وبیشتر به مذاق اهل روز گار حرف زند واز احاطهٔ قواعد وقوانینی که قرار دادهٔ این مردم است به در نرود اما اندازهٔ خوبی زبان نگاه دارد و این پارسی آمیخته بتازی را در کشاکش تصرفات هندی زبانان وپارسی نویس ضائع نگزارد ولغات عربی جزبقدر بایست صرف ننما ید وپیوسته در آن گوشه که سادگی ونغزی شعار او گردد ودر اقسام مکاتیب خاصه در خطوط وعرائض که به حکام نویسد ومشتمل بر معاملات باشد از اعلاق واغراق احتراز واجب داند وسخن به استعاره واشاره نگزارد ونرم گوید و سنجیده گوید وآسان گوید." [۳]

مندرجہ بالا عبارت کو مد نظر رکھتے ہوئے خطوط نگاری میں غالب کے نظریات واضح ہوتے ہیں۔ مثلاً غالب کے مطابق خط لکھنے کا طریقہ اور طرز تحریر ایسی ہو جیسے دو انسان آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس ہو۔ نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا جائے اور خالص فارسی طرز کی پیروی کی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے عربی الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے اور صرف نہایت ضروری حالات میں ہی ان کا استعمال کیا جائے۔ خاص کر عرائض نویسی میں سادہ اور رواں طرز اختیار کی جائے۔

تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی میں عہد غالب میں جہاں ہندوستان میں غالب کے توسط سے نثری ادب میں خاص طور پر نئے رجحان آنے شروع ہوئے۔ اسی دور میں ایران میں بھی ادبی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا۔ عہد افشار کے بعد بارہویں صدی ہجری کے آخر میں یعنی کریم خان زند (۱۱۶۳ھ - ۱۱۹۳ھ) کے دور سے ایران میں ایک بار پھر امن وامان قائم ہوا جس کو قاچار خاندان (۱۷۷۹ء / ۱۱۹۳-۱۹۲۵ء - ۱۳۴۴ھ) کے بادشاہوں نے بڑی حد تک برقرار رکھا۔ اور ایران میں دوبارہ علم وادب کا بازار گرم ہوا اس دور کے کچھ سنجیدہ اور باذوق لوگوں نے اس وقت رائج مصنوعی اور مغلق انداز نگارش کے خلاف صدای احتجاج بلند کیا۔ چنانچہ تیرہویں صدی کی ابتداء ہوتے ہوتے یعنی عصر غالب میں ایران میں ایک اہم ادبی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جو در حقیقت اس مصنوعی اور پیچیدہ سبک کے خلاف بغاوت تھی۔ یہ تحریک تاریخ ادبیات ایران میں سبلک بازگشت کے نام سے مشہور ہے۔ اس بازگشت ادبی میں شعراء وادباء نے ایران کے کلاسیکل سبک کی پیروی کی اور سادگی کو اپنایا۔ سادہ نویسی کی یہ تحریک ادبی نثر میں مقابلتاً بعد میں اور آہستہ تر وجود میں آئی۔ اسکے ابتدائی نقوش گنجینۂ معتمد تالیف میرزا عبدالوہاب نشاط (۱۷۶۱ء / ۱۱۷۵ھ - ۱۸۳۴ء - ۱۲۳۴ھ) انجمن خاقان تالیف فاضل خان گروسی (۱۱۹۸ھ - ۴-۱۲۵۳ھ)، حدائق الجنان تالیف عبدالرزاق بیگ دنبلی (۱۱۷۶ھ - ۱۲۴۳ھ) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے آغاز کے ساتھ جہاں ہندوستان میں انگریزی طاقت زیادہ مجتمع ہو گئی تھی وہیں ایران بھی یوروپ سے متاثر اور مغربی افکار و آثار سے آشنا ہو رہا تھا۔ ایرانی حکام، امراء، ہوشمند ادیب اور پڑھا لکھا طبقہ اپنے ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں اپنی پس ماندگی سے آگاہ ہوئے۔ اور جو لوگ اس عقب ماندگی کے اسباب کو بخوبی جانتے تھے ان میں ناصرالدین شاہ (۱۲۴۷ھ / ۳۲-۱۸۳۱ھ - ۱۸۹۶ء) کے وزیر میرزا تقی خان امیر کبیر (۱۸۰۸ء / ۱۲۲۳ھ - / ۱۲۶۸ھ اور محمد شاہ ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء - ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء) کے صدر اعظم قائم مقام فراہانی (۱۷۷۹ء / ۱۱۹۳ھ - ۳۵-۱۸۳۴ء / ۱۲۵۱ھ) تھے۔ ان دنوں نے ایرانی عوام اور ملک کی اصلاح کے لئے جو کوششیں شروع کیں ان میں ایک سب سے اہم کوشش سلیس طرز نگارش کی طرف عوام کو راغب کرنا تھا۔ ان دونوں کا شمار تیرہویں صدی اور عصر غالب میں ایران کے ماہر نثر نویسوں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے سادہ نویسی کی اس مہم کو خود دربار سے شروع کیا اور سب سے پہلے رسمی مکاتیب کے تکلفات کو ختم کر کے اس کو مصنوع عبارت سے نجات دلوائی۔ امیر کبیر اور قائم مقام نے اپنی تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ سنجیدہ مطالب کے اظہار، خطوط نویسی، تاریخ نویسی، شرح حال نویسی وغیرہ میں آرائش اور رنگارنگی بیکار ہے جس سے اصلی معنی و مفہوم فوت ہو جاتا ہے۔

یحییٰ آرین پور "از صبا تا نیما" میں قائم مقام کی نثر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

" قائم مقام به مقدار زیادی از عبارات متکلف ومتصنع ومضامین پیچیده و تشبیهات بارد ونابجاکاسته وتااندازه ای انشای خود را، مخصوصاًدر مراسلات خصوصی ، به سادگی وگفتار طبیعی نزدیك ساخته است،نثراو، بر خلاف آثار اسلاف وی که پر از جمله ها وعبادت های طویل وقرینه سازیهای مکرروسجعهای خسته کننده است، از جمله های کوتاه ترکیب شده وقرینه هابه ندرت تکرار می شود...از ذکر القاب وتعریفهای تملق آمیز حتی المقدور اجتناب می ورزد. به اشعار فارسی وعربی وآیات قرآنی واحادیث واخبار که شیوهٔ نویسندگان سابق است، خیلی کمتر از اسلاف خود تمسك می جوید وبسیار بجا وبموقع تازه ومتداول، که به کاربردن آنها برای منشیان ونویسندگان محافظه کار بسیار سخت ودشوار بود، پرواه نمی کند وبالا خره نامه های اونسبت به رسم وعادات آن زمان جامعتر وفشرده ترو خاصه در موار دی که میل ندارد مطلبی را صریح بنویسد وموجزو کوتاه وبامقام ومقال متناسب است."[۵]

عصر غالب میں ایران میں جن نثر نگاروں نے رواں اور سادہ طرز نگارش کو عام کیا ان میں امیر کبیر اور قائم مقام کے علاوہ مرزا تقی علی آبادی معروف بہ صاحب دیوان (وفات ۱۲۵۶ھ)، فاضل خان گروسی معروف بہ راوی (۱۱۹۸ھ۔ ۵۴۔ ۱۲۵۳ھ) عبدالرزاق بیگ دنبلی (۱۱۷۶ھ۔ ۱۲۴۳ھ) وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں امیر کبیر اور قائم مقام کی نثر کا

نمونہ پیش کیا جاتا ہے :نمونۂ امیر کبیر :

"قربان خاکپای همایون مبارکت شوم. دستخط همایون زیارت شد. مقرر فرموده بودند که فردایك ساعت بعد از ظهر ایلچی بیاید. خبر کردم امّا چنان می دانم که بیکار نباشد. به یك دو چیز حدس می زنم. اگر طرف عصر کاری نداشته باشند بیرون تشریف می آورند خواستم عرضی بکنم که مبادا فردا جوابی برخلاف مصلحت دولت خودتان بفرمائید. درباب فقرهٔ ثانی حضوراً عرض می شود. زیاد جسارت نوروز باقی الامر همایون."[۶]

نمونۂ نثر قائم مقام:

"ایلچی آن دولت را در پائیتخت این دولت، به اقتضای حوادث ودهر و غوغای کسان اوباجهال شهر ، آسیبی رسید که تدبیر وتدارك آن برذمهٔ کار گزاران این دوست واقعی واجب ولازم افتاد. لهذا اولا برای تمهید مقدمات عذر خواهی وپاس شوکت واحترام آن برادر گرامی ، فرزند ارجمند خسرو میرزارا به پایتخت دولت روسیه فرستاده."[۷]

اگر امیر کبیر، قائم مقام اور دوسرے نثر نگاروں کی نثر کا مطالعہ کریں تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بھی اسی طرز نگارش پر زور دیا جو غالب کی نثر کا خاصہ تھیں۔ خطوط میں القاب و آداب اور تکلفات سے پرہیز کر کے طویل اور پیچیدہ جملوں سے اجتناب کیا۔ اشعار، آیات واحادیث اور عربی عبارات سے بہت کم استفادہ کیا۔ مختصر جملوں کا استعمال اور مطالب کا اختصار کے ساتھ اظہار کرنے پر زور دیا۔ ساتھ ہی نفس مضمون کو عبارت آرائی پر ترجیح دی۔

اور جیسا کہ پنج آہنگ کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی خصوصیات اس وقت غالب کی نثر نویسی اور خصوصاً خطوط میں نمایاں ہیں۔ غالب کے فارسی خطوط میں بھی مروجہ القاب و آداب، خاتمہ اور دعا کے کلمات سے اجتناب کیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے کہ اس سے تحریر مکالمہ کے بہت قریب ہو جاتی ہے۔ چند نمونہ بطور مثال پیش ہیں:

حضرت سلامت ، می دانید که ... (نامه بنام منشی محمد حسن ، ص ۹۶)

حضرت سلامت من که مرازبان در ستایش بیقرار است... (نامه بنام نواب مصطفیٰ خان بهادر ، ص ۱۰۸)

مخلص نواز اولا نامه سترفراز کرد...(نامہ بنام نواب مصطفیٰ خان بہادر، ص۱۰۸)

مهر بان روی مهربان خوی سلامت....(نامہ بنام الف بیگ نام دوستی، ص۱۱۰)

اسی طرح قائم مقام کے منشات کا مطالعہ کرنے پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے بھی زائد القاب و آداب سے پرہیز کیا۔ مثال کے طور پر:

" مخدوم مشفق من..."، " نایب السلطنة بداند..."، " خداوند گارا، صاحب اقتدارا...."۔8

ذیل میں غالب کی کچھ نثری خصوصیات کا مقابلہ قائم مقام کی نثر سے کیا جاتا ہے۔

لہجہ کی صراحت اور صفائی غالب کے خطوط کا اہم حصہ ہے۔ مولوی سید ولایت حسن خان بہادر کو لکھے گئے خط کے اقتباس سے غالب کی نثر کی اس خصوصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

" قبله حاجات ، هر چند دشوار است به هجران زیستن ودانم که بیدوست نتوان زیستن لیکن بند ارادت از جانب خویش بدان اندازه استواری می نگرم که اگر بفرض محال صد سال وصد هزار سال به فراقم گردد خاطر را همان به سوی وفا گرایش ومهربان همان روی در افزایش خواهد بود. امید که هم درین شمار تفقدوالتفات ازان طرف نیز روز افزون باشد....9

اس خصوصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے قائم مقام کے ایک خط کا، جو وقائع نگار کو لکھا گیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

" جاده خراسان را شما پیش پای ما گذاشتید وحالا می فرمائید پول پارسالی هنوز نرسیده است. شما لطف کنید مارا بر حسب دلخواه باز آرید. پنج را پنج هزار بگیرند. ماکجا اینجا کجا؟ مرغ مسکین چه خبر داشت که گلزاری

هست!..."[۱۰]

شگفتہ، شیریں اور دلپزیر انداز بیان جابجا غالب اور قائم مقام دونوں کی نثر میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ذیل میں دیے گئے اقتباسات سے ان کے اس دلنشین انداز کی تائید ہوتی ہے۔ مولوی سراج الدین احمد کو لکھے گئے اس خط میں غالب کہتے ہیں:

" زینهار صد زینهار ای مولویؒ سراج الدین بترس از خدای جهان آفرین که چون قیامت قائم گردد وآفرید گار به داد بنشیند من گریبان ومویه کنان در آن هنگامه آیم در تو آویزم وگویم که این آنکس است که یك عمر مرا به محبت فریفت ودلم برد چون من از سادگی بروفاتکیه کردم واین راز را از دوستان برگزیدم نفس کج باخت وبه من بیوفائی کرد. خدا را بگوکه آنزمان چه جواب خواهی داد وچه عذر پیش خواهی آورد"[۱۱]

قائم مقام کو بھی زبان وبیان پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ معمولی بات بھی نہایت دلچسپ انداز میں پیش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر:

" به خدا که بی آن جان عزیز شهر تبریز برای من تب خیز است بلکه از ملك آذر بایجان آذر هابه جان دارم...."[۱۲]

غالب کے نثر کی ایک اور امتیازی خصوصیت مختصر جملوں کا استعمال ہے۔ غالب نے طویل جملوں سے گریز کیا اور اسی وجہ سے ان کی نثر خصوصاً خطوط روزمرہ گفتگو سے قریب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کہتے ہیں:

" حضرت سلامت، رسیدن دلنواز نامه دل راتنومند وشاخ آرزو را برومند ساخت. گله از نار سیدن پاسخ نامهای خویش میکنند واز خداشرم ندارند. من خود راجانب شما نگرامی داشتم که کجائید وچه در سر دارید. باری پرده از روی کار شما برگرفتم ودانستم که یکچند مرا فراموش کرده اید...."[۱۳]

قائم مقام کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں یہ خصوصیت پوری آب وتاب کے

ساتھ نظر آتی ہے:

"نایب سلطنته بداند که مقرب الخاقان قائم مقام را که به در بار دولت هما یون فرستاده بود،وارد شد واز مطالب مصحوبی او استحضار حاصل آمد ، عرضها را کردو وعذر ها را خواست....."[۱۴]

غالب اور قائم مقام کی مندرجہ بالا نثر کی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے جس زمانہ میں ہندوستان میں جس سادہ نویسی کی تحریک کا آغاز کیا اور سلیس اندازہ بیان کو اپنایا، غیر ضروری عبارت پردازی سے اجتناب کیا، تقریباً اسی دور میں یہ تحریک ایران میں پروان چڑھی اور اس کے زیر اثر ایران میں روشن فکر لوگوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا۔ انہوں نے فارسی طرز نگارش کو یکسر بدل دیا اور جدید رجحانات کو اپنا موضوع بنایا۔

حواشی:

۱۔ یادگار غالب، حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ کلیات نثر غالب، مہر نیمروز، چاپ نولکشور، ۱۸۷۱ء/ ۱۲۸۷ھ، ص ۲۶۷۔

۳۔ کلیات نثر غالب، مہر نیمروز، چاپ نولکشور، ۱۸۷۱ء/ ۱۲۸۷ھ، ص ۲۷۴۔

۴۔ کلیات نثر غالب، مہر نیمروز، چاپ نولکشور، ۱۸۷۱ء/ ۱۲۸۷ھ، ص ۵۔

۵۔ از صبا تا نیما یحیی آرین پور، ج اول، انتشارات زوار، چاپ چہارم، ۱۳۷۲ھ، ص ۶۵۔

۶۔ میرزا تقی خاں امیر کبیر، عباس اقبال آشتیانی، چاپ سوم، تہران ۱۳۶۳ھ، ص ۴۶۸۔

۷۔ از صبا تا نیما، ص ۱۸۵۔

۸۔ تاریخ ادبیات، دکتر توفیق. ھ. سبحانی، ج ۴ مرکز چاپ وانتشارات، دانشگاہ پیام نور، چاپ ششم، ۱۳۷۵ھ، ص ۱۸۵۔

۹۔ کلیات نثر غالب، ص ۱۸۵۔

۱۰۔ از صبا تا نیما، ص ۱۷۔

۱۱۔ کلیات نثر غالب، ص ۱۴۳۔

۱۲۔ تاریخ ادبیات، ص ۶۶۔

۱۳۔ کلیات نثر غالب، ۱۲۴۔

۱۴۔ تاریخ ادبیات، ص ۶۶۔

☆☆☆☆☆☆☆

پنجتن پاک اہل عبا کے فضائل پر ایک نظر

قاضی سید شاہ رفیع الدین قادری، کرناٹک

فمبلغ العلم فیه انه بشر

وانه خیر خلق الله کلهم

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں ہمارے علم کی انتہاء یہ ہے کہ آپ خیر البشر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے قرب اور کمال کے جس مرتبے تک آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہنچے وہاں نہ کسی نبی مرسل کی رسائی ہوئی نہ کسی مقرب فرشتے کی۔

اجلہ ائمہ مثلاً امام فخر الدین رازی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اگر تمام انبیاء ورسل علیہ صلوۃ والسلام کے فضائل شخص واحد میں جمع ہو جائیں اور انکا مقابلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فضائل جلیلہ سے کیا جائے تو آپ کے فضائل ان پر غالب ہوں گے۔ حضرات انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کے خصوصیات کا لحاظ ہو یا عموم کا حضرت آقاء نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فضائل ان سب سے افضل واعلیٰ ہیں۔ اور آپ کی شریعت بھی تمام انبیاء کی شریعتوں سے اعلیٰ ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امت تمام انبیاء ومرسلین کی امت میں افضل ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اہل بیت اور اصحاب تمام انبیاء کے اہل بیت واصحاب سے افضل ہیں۔

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ آپ کے فضائل واوصاف شریفہ میں لکھی گئی کتابوں مثلاً شفاء شریف مواہب الدنیہ اور سیرت پاک کی دیگر کتابوں کا مطالعہ کرے تاکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مقام اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضائل وکمالات کو جانے جن کی حقیقت بیان کرنے سے زبان قاصر اور قلم عاجز ہیں۔ اور دن بدن آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مرتبہ میں ترقی ہی ترقی کا انکشاف ہوتا چلا جارہا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے آقاء و مولا تاجدار انبیاء علیہ صلوۃ والسلام تمام مخلوق خداوندی میں سب سے افضل ہیں اور تمام آسمانی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور آپ سے اوپر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا مقام نہیں ہے" بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔

امام ترمذی وغیرہ نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے مجھے اپنے اہل و عیال میں سب سے زیادہ محبوب فاطمہ ہیں۔ امام بخاری راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا فاطمہؑ میرے جسم کا حصہ ہے۔ اس کی ناراضگی کا سبب میری ناراضگی کا سبب ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جس نے انہیں ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ ابن عبدالبر راوی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بیٹی کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم دنیا کی تمام عورتوں کی سردار رہو۔ انہوں نے عرض کیا۔ ابا جان! پھر حضرت مریم کا کیا مقام ہے؟ فرمایا وہ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہیں۔ بہت سے محققین، جن میں علامہ تقی الدین سبکی علامہ جلال الدین سیوطی علامہ بدرالدین زرکشی اور تقی الدین مقریزی بھی شامل ہیں، تصریح فرماتے ہیں کہ حضرت بی بی فاطمہؑ تمام دنیا کی عورتوں میں حتیٰ کہ سیدہ مریمؑ سے بھی افضل ہیں۔ علامہ منادی کا ارشاد ہے سلف و خلف کی ایک جماعت نے فرمایا کہ ہم کسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی لخت جگر کے برابر قرار نہیں دیتے۔ بعض حضرات نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی باقی اولاد حضرت بی بی فاطمہ کی مثل ہے۔ رضوان اللہ علیہم۔ ابو یعلیٰ کی حضرت عمر فاروقؓ سے روایت کردہ مرفوع حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حکماء کی نظر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صاحب زادیوں کو ازواج مطہرات پر فضیلت ہے۔ مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت بی بی فاطمہؑ و حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد کو کلید رحمت خزانۂ حکمت اور امت کے لئے امین بنایا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ غزوہ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس موقع پر آپؐ کو مدینہ طیبہ میں مقرر فرما کر جاتے ہوئے فرمایا۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی مقام حاصل ہو جو حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ یعنی ان کی حیات مبارکہ میں خلیفہ بنے۔ اکثر غزوات میں جھنڈا آپ

کے ہاتھ میں رہا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صحابی کرام (مہاجرین وانصار) کو آپس میں بھائی بھائی بنایا تو ان سے فرمایا تم میرے بھائی ہو۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت امام احمد نے فرمایا جتنے فضائل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے منقول ہیں کسی صحابی کے لئے اتنے فضائل منقول نہیں۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تم علی مرتضی سے کیا چاہتے ہو۔ بے شک علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ اور وہ میرے بعد ہر صاحب ایمان کے دوست ہیں۔ حضرت عباس کہتے ہیں حضرت علی مرتضیٰ کو علم کے دس میں سے نو حصے عطا کئے گئے اور بخدا وہ باقی دسویں حصے میں بھی لوگوں کے ساتھ شریک تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسنؑ بن علیؑ کو کندھے پر بٹھایا ہوا ہے اور دعا فرما رہے ہیں (اے اللہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے محبوب رکھ) حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اے اللہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں اور اس سے محبت کرنے والے کو بھی محبوب رکھتا ہوں۔

جب حضرت امام حسنؑ رضای الٰہی کے لئے خلافت سے دست بردار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو اس کے عوض خلافت باطنیہ عطا فرمادی حتی کہ ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ ہر زمانے میں قطب اولیہ اہل بیت ہی سے ہوا کرتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اے اللہ جو حسینؑ کو دوست رکھے تو اس کو محبوب رکھ۔ حسین ان کے نواسوں میں سے ایک تھے۔ حضرت حسینؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ امام طبرانی نے یہ حدیث بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی اولاد ان کی پشت میں رکھی ہے اور میری اولاد علی بن ابی طالب کی پشت میں رکھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت ام سلمہ کے گھر میں استراحت فرما رہے تھے۔ آپ نے حریر کی بنی ہوئی چادر زیب تن کی ہوئی تھی۔ اتنے میں حضرت بی بی فاطمہ ایک ہنڈیا لائیں جس میں خزیرہ (قیمہ میں آٹا ڈال کر اسے اچھی طرح پکاتے ہیں) تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ اپنے شوہر (حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ) (اور اپنے صاحب زادوں حضرات حسنین کریمین رضوان اللہ علیہم) کو بلاؤ۔ حضرت خاتون جنت نے انہیں بلایا وہ ابھی تناول فرما ہی رہے تھے کہ آیۂ تطہیر نازل ہوئی ۔ انما یُرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّر کم تطھیراً۔ سورہ احزاب آیت ۳۳) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سب کو چادر سے ڈھانپ لیا۔ اور دست مبارک باہر نکال کر آسمان کی طرف اٹھایا اور دعا کی۔

اے اللہ یہ میرے اہل بیت اور حمایتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ میرے خواص ہیں۔ ان سے پلیدی دور فرما اور انہیں پاک و صاف فرما۔ یہ کلمات تین مرتبہ کہے۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے پردہ اٹھا کر اپنا سر داخل کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں فرمایا تم بھلائی پر ہو۔ تم بھلائی پر ہو۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آیۂ تطہیر اہلِ عباء کے ساتھ خاص ہے۔

اہل بیت سے مراد صرف اہل عباء ہیں۔ یہ صحابہ سے حضرات ابو سعید خدریؓ اور تابعین میں حضرت مجاہد و قتادہ کا قول ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ ایھا الناس قد ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی۔ (اے لوگوں میں نے تم میں دو چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اسے اپناؤ گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ قرآن پاک اور میری عترت اہل بیت) قرآن پاک کو اپنانا تو یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا جائے۔ اور اہل بیت کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے استحقاق کے مطابق ان سے محبت و عنایت کا سلوک کیا جائے۔ اور ان کی تعظیم و تکریم اور عزت افزائی کی جائے۔

مزید حضرت زید بن ارقمؓ کا ارشاد بھی توجیہ طلب ہے جب حضرت حصین نے ان سے پوچھا کہ اہل بیت کون ہیں۔؟ تو انہوں نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد جن پر صدقہ حرام ہے یہ ہمارے مقصود میں نص تھے کیونکہ صدقہ تو اہل بیت کے ہر فرد پر حرام ہے اسی طرح حضرت حذیفہ بن اسیدؓ کی روایت جس کو حضرت حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے دو چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا۔ غور کرو کہ میرے بعد تم ان دونوں سے کیا معاملہ کرتے ہو۔؟ بڑی اور اہم چیز کتاب اللہ ہے۔ وہ ایسا وسیلہ ہے جس کا ایک کنارہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور دوسرا کنارہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ تم نہ گمراہ ہو گے اور نہ تبدیلی کے مرتکب۔ اور دوسری اہم چیز میری عترت اور اہل بیت ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔ (نقل اکبر کتاب اللہ ہے وہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس کا ایک سرا اللہ پاک کے دست مبارک میں اور دوسرا تمہارے ہاتھ میں (تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو نہ گمراہ ہو گے اور

جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے دو چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا۔ غور کرو کہ میرے بعد تم ان دونوں سے کیا معاملہ کرتے ہو۔؟ بڑی اور اہم چیز کتاب اللہ ہے۔ وہ ایسا وسیلہ ہے جس کا ایک کنارہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور دوسرا کنارہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ تم نہ گمراہ ہو گے اور نہ تبدیلی کے مرتکب۔ اور دوسری اہم چیز میری عترت اور اہل بیت ہیں۔

نہ تبدیلی کے مرتکب) یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہدایت حاصل کرنے اور گمراہی سے نجات کے لئے تھامنا قرآن پاک کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا ہے۔

حضرت زید بن ارقم نے فرمایا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کتاب کے ساتھ اہلبیت کا ذکر ان کی شایان شان تعظیم تکریم کا تاکیدی حکم فرمانے کے لئے کیا ہے۔ بے شک اہل بیت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے بھی مستحق تعظیم ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر ایک لاکھ صحابہ کے جم غفیر میں جو امت مسلمہ کا ایک عظیم اجتماع تھا جس میں حضرت ابو بکرؓ اور ان کے علاوہ دیگر جلیل القدر صحابہ بھی موجود تھے، اس اجتماع میں امت مسلمہ کی طرف مخاطب ہو کر قرآن پاک و اہل بیت کے

دامن کو مضبوطی سے تھامنے کا تذکرہ کیا ہے۔ صبانے اسعاف الراغبین میں کہا میں تمہیں اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔ ابن عسقلان نے شرح ریاض الصالحین میں کہا۔ دو دفعہ یہ بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت کے بارے میں تاکید اُوصیت فرمائی اور اس امر کا مطالبہ فرمایا کہ ان کی شان کا اہتمام کرنا۔ یہ وہ واجب مؤکدہ ہے جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور اس پر ابھارا گیا ہے امام احمد کی روایت ہے "قریب ہے کہ مجھے بلایا جائے تو میں تعمیل کروں اور میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں (۱) کتاب اللہ جو ایک رسی ہے آسمان سے زمین تک (۲) میری عترت اور اہل بیت مجھے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات نہ کرلیں۔ تم غور کرو میرے بعد ان دونوں سے کیا معاملہ کرتے ہو۔ حبل ممدود سے مراد اللہ تعالیٰ کا عہد ہے یا اللہ تعالیٰ کی رحمت و رضا تک پہنچانے کا سبب ہے"۔ یہ امام نووی کا کلام تھا۔ حضرت حذیفہ بن اسید غفاریؓ فرماتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حجۃ الوداع سے فارغ ہوئے اور خطبہ دیا اس میں کہا میں تم سے دو گرانقدر چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا تم دیکھو میرے بعد ان سے کیا معاملہ کرو گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے انہیں بلایا پھر یہ آیت تطہیر تلاوت کی انّما یُرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّرکم تطھیراً۔ بے شک اہلبیت ان کی اولاد میں شامل ہیں اور وہ برگزیدہ ہیں لیکن معصوم نہیں ہیں[۱] عصمت صرف انبیاء کرام کے لئے۔ دوسروں کے لئے امتحان ہے۔ امتحان اسی شخص کا ہوتا ہے جس کے لئے امور پوشیدہ رہیں۔ جو امور کا معاینہ اور مشاہدہ کرے وہ امتحان سے آگے گزر گیا ہے۔ آپ کا ارشاد یہ ہے کہ وہ دونوں یعنی قرآن و اہلبیت ایک دوسرے سے جدا ہونے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے ملاقات کریں گے۔ جب تک تم ان کو تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔

۱۔ اثنا عشری عقیدہ کے مطابق تمام ائمہ معصوم ہیں (ادارہ)

☆☆☆☆☆

کلام اقبال اور ذکر علیؑ

از: حسن مثنیٰ

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام نامی اردو ادب کو سنوارنے نکھارنے اور چمن اردو میں باغ و بہار لانے والوں میں سے ایک معتبر اور اہم نام ہے۔ ان کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف اردو ادب کو نت نئے تخیلات اور فلسفے سے مالا مال کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے قرآن مجید، احادیث رسول اور ذکرِ صحابہ کرام کو ماخذ و منبع بنالیا۔ قرآن مجید سے غیر معمولی شغف اور اس کے عمیق مطالعے نے انہیں فکر و نظر کی وہ وسعتیں اور بلندیاں عطا کی تھیں جو ان کے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری کا حرف بہ حرف ان تعلیمات کا مرہون منت ہے جو انہیں اس ماحول سے حاصل ہوئی تھی جس کے وہ پروردہ تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس بیان کا مدعا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں فلسفۂ قرآن اور تعلیمات قرآنی کی ترویج و اشاعت کو اہمیت دی اور قرآن کو مسائل حیات اور ان کے حل کے طور پر پیش کیا۔ قرآن کریم نے ان کو وہ انقلابی اور آفاقی فکر عطا کی تھی جس نے مغربی تہذیب کو مشرق سے متعارف کرایا اور قرآن حکیم کی تعلیمات کے آئینہ میں انسانوں کے ذریعہ عالم انسانیت کے فلاح و بہبود کی تلقین کی اور اس سلسلے میں انہوں نے مختلف استعارات، تشبیہات اور رمز و کنایہ سے کام لیا اور اپنی شاعری میں مرد مومن، شاہین وغیرہ جیسے اچھوتے اور نئے استعارات استعمال کیے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نادر اصطلاحات بھی وضع کیں۔ مرد مومن کے لئے حضرت علیؑ کا انتخاب کیا جن کی ذات ستودہ صفات میں علم، عمل اور عشق کی تینوں خوبیاں بیک وقت جمع نظر آتی ہیں۔

یوں تو شاعر مشرق کی نظم "زہد اور رندی" کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے مکمل آشنا نہیں تھے جس کا انہوں نے اقرار بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ میرے بحر خیالات کا پانی بہت ہی عمیق ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ ان کے بحر خیالات و تخیلات کا پانی بہت گہرا ہے جس میں ان کے افکار کے دو دھارے بجا طور پر نمایاں ہیں۔ ایک تو شاعرانہ اور دوسرا فلسفیانہ اور اسی گہرائی میں ولایت علیؑ بھی مضمر ہے۔ دراصل حضرت علیؑ سے ان کی عقیدت مندی ان کی تربیت کا نتیجہ تھی جس میں ان کی والدہ گرامی امام بی بی کا اہم کردار ہے۔ گرچہ حضرت علیؑ سے اقبال کی عقیدت مندی زمانۂ طالب علمی میں ہی گھر کر چکی تھی مگر انہوں نے بہت بعد تک نہ تو مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا اور نہ ہی حضرت علیؑ پر کوئی شعر کہے تھے لیکن ان کے حلقۂ ارباب میں یہ شہرہ تھا کہ اقبال تشیع سے بہت متاثر ہیں اس امر سے انحراف ممکن نہیں۔ ملاحظہ ہو "زہد اور رندی" کے یہ اشعار جو اس بات پر دلالت کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
خضر نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کے ہیں تری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنا اس کی زبانی [1]

ڈاکٹر اقبال کے ابتدائی کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے کلام میں وسیع المشربی موجود ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ مسلم صوفیاء و مفکر کے ساتھ ساتھ شنکر اچاریہ کے

اس ویدانتی فلسفہ کے مثبت پہلوؤں سے بھی کافی متاثر تھے جس میں تسلیم و رضا احساس خودی اور شان بے نیازی نہایت ہی اہم ہیں۔ اسی وجہ سے ان پر بھی مختلف قسم کی الزام تراشیاں کی گئیں۔

علامہ اقبال کی شاعری میں عشق اور خودی کا تصور بہت زیادہ کار فرما نظر آتا ہے۔ عشق اقبال کے افکار و تصورات کا ایک ایسا اہم جزو ہے جس سے ان کی مراد نص قرآن اور عشق رسول ہے جو صحابہؓ کرام کے جذبہ ایمانی کا محرک بھی تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ جہاں عشق کے بہت سارے روپ بتائے ہیں وہیں اس کی ایک شکل حضرت علیؓ کی ذات بابرکت بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرود انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق [۲]
جمال عشق و مستی ظرف حیدر
زوال عشق و مستی حرف رازی [۳]

مندرجہ بالا اشعار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال عشق کے طالب نظر آتے ہیں لیکن جلد ہی اقبال بصیرت کی گہرائیوں میں اتر کر یہ بخوبی سمجھ جاتے ہیں کہ سمجھ اتنی عام شئے نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس کو مل جائے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللہی [۴]

حضرت علیؓ سے اس والہانہ عقیدت، قلبی شیفتگی اور جذباتی لگاؤ نے اقبال کے ان اشعار کو عجیب کیف اور سوز و گداز سے بھر دیا ہے جو ذکر علی سے مزین ہیں۔ اقبال اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کی تخصیص کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق [۵]

علامہ اقبال کے افکار میں خودی اور عشق کے علاوہ فقر بھی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی نظر میں ایک دوسرے میں یہ اس طرح پروئے گئے ہیں جیسے تسبیح کے دانے ساتھ ساتھ پروئے ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بار بار باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ فقر دنیا سے بے رغبتی کے مترادف ہے جس کے متعلق حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔ "اے دنیا! اے دنیا دور ہو مجھ سے۔ کیا میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے؟ یا میری دلدادہ و فریفتہ بن کر آتی ہے تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے سکے) بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ جا کسی اور کو فریب دے۔ مجھے تیری خواہش نہیں ہے میں تو تجھے تین طلاق دے چکا ہوں جس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں" ۶

دوسری جگہ وہ دنیا کو ان الفاظ میں متعارف فرماتے ہیں "دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جو چھونے میں نرم معلوم ہوتا ہے مگر اس کا زہر مہلک ہوتا ہے۔" ۷

ڈاکٹر اقبال نے حضرت علیؑ کے فقر کی یہ شان بتائی ہے کہ۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی ۸
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری ۹

اقبال گہری بصیرت کے ساتھ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی ! ۱۰

اقبال کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو عمل اور موت کو سکوت قرار دیا ہے اور اللہ والے ہر حال میں عمل کو گلے لگائے رہتے ہیں اور حق کے لئے جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔ اسلامی جنگوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو بہت سارے جوانمرد ایسے ملیں گے جنہوں نے اسلام کی بقا کے لئے خود کو نثار کر دیا لیکن حق سے منہ نہیں موڑا اور مثل شیر جرار و کرار ہوئے نہ کہ فرار اور انہیں میں سے ایک شیر، شیر خدا حضرت علیؑ ہیں، جنہوں نے میدان سے فرار اختیار نہ کیا بلکہ میدان جنگ میں "کانھم

بنیان مرصوص" (آپ لوگوں کی شان یہ ہے کہ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بنے رہے یعنی علی کی ذات ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن کو دیکھ کر مد مقابل آنے والی طاقت پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی
میری اکسیر نے شیشہ کو بخشی سختی خارا [11]
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا ؟ زور حیدر ، فقر بوذر، صدق سلمانی [12]

ڈاکٹر اقبال کی نظر میں علیؑ کا یہ فقر دنیوی سلطنت و سطوت سے بہت بلند ہے اس لئے کہ علی کی نظر میں سلطنت و شکوہ پادشاہی کی وقعت کچھ نہیں تھی۔ علی کی نظر میں سلطنت و پادشاہی اس وقت کچھ حیثیت رکھتی ہے جب وہ قیام حق کے لئے قائم ہو۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری [13]

علامہ اقبال کی نظر میں نان شعیر پر گزر بسر کرنے والے بہت ملتے ہیں لیکن نان شعیر پر بسر کرنے والوں میں کوئی قوت حیدری کا مالک نہیں کیونکہ قوت حیدری فراہم کرنے کے لئے کسی ایسے جوہر کی ضرورت ہے جو ایمان سے پیدا ہوتا ہے اور اگر یہ ایمانی طاقت ہاتھ لگ جائے تو فقر و غنا کی ضرورت نہیں درپیش ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کلام الٰہی اور تعلیمات نبوی کی مجلی سے مسلمانوں کے اندر حرارت اور روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ دعا کی ہے کہ

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر [14]

کلام اقبال میں حضرت علیؑ کی شجاعت، جرائت مندی اور جانبازی کا ایسا مثالی پیکر ملتا ہے

جو اردو شاعری میں کسی دوسرے شخص کے یہاں نہیں ملتا اور اسی لئے اقبال نے اپنے کلام میں حضرت علیؓ کا نام نہ لے کر ان کے خطابات والقاب مثلاً حیدر، حیدر کرار، خیبر شکن، اسد اللہ وغیرہ کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے۔ اقبال نے یہ سارے القاب بڑے ہی اچھوتے اور نرالے انداز میں برتے ہیں مثلاً غزوۂ خیبر کی مثال دے کر انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ صورتحال پر اظہار تاسف بھی کیا ہے اور ان عظیم کارناموں کی یاد لائی ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے ۱۵

اس شعر میں نہ صرف مولائے کائنات کی حمد وثنا کی گئی ہے بلکہ ان سے اپنی بے انتہا عقیدت مندی کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور اس بات کی جانب اشارہ بھی ہے کہ معرکہ خیبر میں تو ہم یہودیوں کے ایک گروہ سے نبرد آزما تھے جبکہ آج مسلمانوں کو مختلف مذاہب اور گروہوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس شعر کے ذریعے اقبال نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت تو حضرت علیؓ جیسے حیدر کرار تھے جنہوں نے باطل پر فتح پائی اور حق غالب رہا لیکن افسوس صد افسوس کہ آج ہمیں ایسے رہنما میسر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کی بصیرت وبصارت نے بہت جلد اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کے تنزل میں جانے کا سبب مغربی تہذیب وتمدن کی کورانہ تقلید ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ذات علی شمع ہدایت بن سکتی ہے اور ہمیں ہمارا کھویا ہوا وقار عطا کر سکتی ہے۔ تب ہی تو سر محمد اقبال نے علی کی جانبازی اور حق پر مکمل ایقان وایمان کے منظر کو اپنے اشعار میں یوں پیش کیا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی ۱۶

اس شعر میں اقبال نے علی کی جانبازی دکھاتے ہوئے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے علی ہی فی الحقیقت مرد مومن ہیں اور وہ اس قدر جانباز ہیں کہ بغیر تلوار بھی دشمنان اسلام سے لڑتے ہیں اور انہیں کسی قسم کے ہتھیار نیزہ وتلوار یہاں تک کہ عصا کی بھی ضرورت نہیں بلکہ شب ہجرت تلوار کے سائے میں اطمینان سے سو رہتے ہیں۔ وہ دراصل رحم کرنے والوں میں سب سے بڑے رحیم وکریم ہیں

اور اپنے جانی دشمن کو بھی معاف کر دینے والے ہیں مگر جب معزز معرکۂ حق و باطل کا بازار گرم ہو جاتا ہے تو میدان میں عرصۂ لافتیٰ کے شہسوار ہوتے ہیں اور در حقیقت حیدر کرار بن کر رسول کی لفظوں میں میدان میں ڈٹ جاتے ہیں آنحضرت نے فرمایا۔

"کل علم میں ایسے مرد کو دوں گا کہ جو کرار ہو گا میدان سے بھاگنے والا نہیں ہو گا۔ اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے اور وہ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہو گا اور وہ اس وقت تک میدان سے واپس نہیں ہو گا جب تک کہ خدا اس کے ہاتھ میں فتح نہ دے دے گا۔ ۱۷

پھر اقبال غزوۂ خیبر کی مثال دے کر بتا رہے ہیں کہ حق و باطل کی یہ معرکہ آرائی کوئی نئی بات نہیں بلکہ مرحب و عنتر تو ہر زمانے میں حق کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں شرط صرف یہ ہے کہ ہم فطرت اسد اللہ پیدا کریں۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی ، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری ۱۸

ایک طرف اقبال نے جہاں اپنی نظم شکوہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر خدا سے شکایت کی کہ

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا؟ اس کو کیا سر کس نے ۱۹

تو دوسری جانب جواب شکوہ میں یہ فرماتے ہیں:

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے ؟
حیدری فقر ہے ، نہ دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر ۲۰

مندرجہ بالا اشعار میں انداز مسلمانی سے مراد اتباع رسول ہے اور حیدری فقر سے مراد طرز

اسد اللہی۔ اپنے اسلاف سے روحانی نسبت نہیں ہونے کی وجہ سے ہی اقبال مسلمانوں پر طنز کرتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی [۲۱]

شاعر مشرق اقبال کا حضرت علی کے حضور میں عقیدت گزاری اور نیاز مندی کا یہ عالم ہے۔

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف [۲۲]

یادہ کہتے ہیں کہ

یہ ہے اقبال فیض یاد نام مرتضی جس سے
نگاہ فکر میں خلوت سرائے لامکان تک ہے

اور پھر ڈاکٹر اقبال زمانے کی بگڑی ہوئی تیوریوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی سچی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دل میں ہے اس بے عمل کے داغ عشق اہل بیتؑ
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظل دامن حیدرؑ مجھے

مختصر یہ کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کو وسیلہ بنا کر اپنی بے انتہا عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے حضرت علی کی تعلیمات کو عام کرنے کی سعی کی اور فضائل علیؑ کو جزو ایمان بنا کر مسلمانوں کے اندر دوبارہ نئی روح پھونکنے کا کام کیا۔ اقبال ایک مشکل پسند مفکر ہیں۔ جنہوں نے اپنی شاعری کی وساطت سے انسانی افکار کے مختلف دریچے وا کئے، عظمت انسان کے مخفی رازوں کو ظاہر و ہویدا کرنے کی کامیاب کوشش کی،، مرد مومن کے کمالات سے متعارف کرایا، بغض و عناد سے نفرت دلائی اور وطن کی محبت جسے نصف ایمان قرار دیا گیا ہے کا نغمہ گنگنایا، نیز مغرب کی اس وطنیت سے متنبہ کیا جس کی ضرب سے کائنات زخمی اور انسانیت خون میں غرق ہو رہی تھی۔ اقبال کے یہاں حب علی صرف ان کی اپنی ذات تک ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے عالم انسانیت کو اس نور سے کسب فیض کا درس بھی دیا ہے۔ وہ شعلوں سے گل چینی کرتے ہیں اور آپ کی شمشیر یعنی ذوالفقار کو آب

حیات سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ولولہ انگیز اور روح پرور اشعار سے قوم کو جہادِ زندگی کے لئے آمادہ کیا اور انہیں اپنی عظمتِ رفتہ اور دولتِ گمشدہ کی بازیابی کا بھی حوصلہ عطا کیا۔ خصوصاً علی کے عشق اور عمل کو علامت بنا کر مسلمانوں میں حیدری فقر کے ساتھ بازوئے حیدر اور زورِ حیدر پیدا کرنے کی تلقین کی ہے اور اس کو بروئے کار لانے میں اسمائے علیؑ مرتضیٰ اور صفاتِ علی مرتضیٰ کا سہارا لیتے ہوئے اپنی شاعری کی اساس قائم کی ہے اور یہی ان کے کلام کی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ تمام شاعروں میں ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے لطیف ترین، دقیق ترین اور نادر و نایاب مضامین کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کوئی بھی ذی فہم ان کی اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ اقبال نے بعض مضامین اور تاریخی واقعات کو بھی صرف ایک شعر میں بیان کر دیا ہے جسے ایک ماہر نثر نگار کئی صفحوں میں بھی شاید ہی پوری طرح بیان کر پائے۔

مآخذ

۱۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۵۹
۲۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۸۷
۳۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۸۳
۴۔ کلیاتِ اقبال ضربِ کلیم۔ ص ۶۳۶
۵۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۱۱۲
۶۔ کلمات قصار ۷۷ نہج البلاغہ۔ ص ۸۲۶
۷۔ نہج البلاغہ مکتوب ۶۸۔ ص ۷۹۲
۸۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۳۴۹
۹۔ کلیاتِ اقبال ضربِ کلیم۔ ص ۶۳۳
۱۰۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۳۴۹
۱۱۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۱۳۷
۱۲۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۲۷۰
۱۳۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۲۵۲
۱۴۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۳۰۱
۱۵۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۳۵۶
۱۶۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۴۲۷
۱۷۔ صحیح بخاری
۱۸۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۲۵۳
۱۹۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۱۶۵
۲۰۔ کلیاتِ اقبال بانگ درا۔ ص ۲۰۔ ۲۰۳
۲۱۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۴۱۲
۲۲۔ کلیاتِ اقبال بال جبریل۔ ص ۳۳۲

☆☆☆☆

نہج البلاغہ

اسلامی فلسفہ و عرفان کا سرچشمہ

از: رضا عباس۔ علیگڑھ

مستشرقین کا ہمیشہ سے یہ رویہ رہا ہے کہ انہوں نے اسلامی فلسفے اور عرفانی افکار کے ماخذ دوسرے مذاہب اور مکاتب فکر میں تلاش کئے۔ اگر ہم اسلامی فلسفے کی کسی بھی مغربی تاریخ کا مطالعہ کریں تو عموماً پہلا باب اسلامی فکر کے غیر اسلامی ماخذوں کی بحثوں پر مشتمل ملے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی افکار اور فلسفے کی جڑیں اسلام کے اندر ہی ڈھونڈنے کی سنجیدہ کوشش ابھی تک عمل میں نہیں آئی ہے۔ فلسفہ اور عرفان کے اولین اسلامی ماخذ قرآن کو ان مغربی علماء نے صرف عمل اور جہاد کے لائحہ عمل سے تعبیر کیا۔ ان علمائے کرام کی نظر میں عربوں کا مزاج کسی بھی سنجیدہ فکری اور استدلالی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

فہم قرآن کے سلسلے میں ان لوگوں کی چشم بصیرت پر تعصب کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور انہیں قرآنی طرز استدلال اور عرفانی افکار میں کوئی نئی بات نظر نہیں آئی مزید برآں انہوں نے قرآنی دلائل اور ان کے نتیجوں کو بچکانہ اور کم اہمیت گردانا۔ ان کا ذہن وحی الٰہی کے اس معجزانہ طرز تکلم کا فہم پیدا نہ کر سکا جس کی وجہ سے یہ کتاب کسی طبقہ یا گروہ کے لئے محدود نہ ہو کر زمان و مکان کی قید سے آزاد ایک آفاقی صحیفۂ ہدایت قرار پائی۔

فی الحقیقت، اسلامی سماج میں غیر اسلامی افکار کی شروعات تب ہوئی جب عباسی حکومت نے اہلبیت رسول سے اپنی عداوت اور بعض سیاسی مصالح کی بنا پر یونانی آئمہ فکر ارسطو، سقراط، اور افلاطون، کے فلسفے کا عربی زبان میں ترجمہ کروا کر اسلامی سلطنت کے گوشہ و کنار میں انکا اشتہار کیا۔ یونانی فلسفہ

کی اسلامی معاشرے میں در آمد کے پیچھے عباسی حکومت کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ کسی طرح علماء اور عوام الناس کو حکومتی معاملوں سے الگ کر کے منطق، اور فلسفے کے غیر ضروری مباحث میں الجھادیا جائے، تاکہ بادشاہ وقت امت مسلمہ کے واجب حقوق کو پامال کرتے ہوئے اپنے عیش ونوش کو جاری رکھ سکے۔

قرآنی تعلیمات پر مبنی فلسفیانہ افکار کو رد کر کے یونانی فلسفہ باہر سے منگانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قرآنی فلسفہ وفکر کے ہر نتیجے سے عمل اور اصلاح کا ایک پہلو نکلتا تھا، سماجی ذاتی اور سیاسی زندگی میں معاشرے کی ہدایت کے اصول مرتب ہوتے تھے، جنکی ان مدعیان خلافت کو کوئی ضرورت نہ تھی، انہیں ایسے فلسفیانہ افکار درکار تھے جو علمی قدر وقیمت کے حامل تو ہوں لیکن عملی زندگی سے ان کا کوئی سروکار نہ ہو۔ گویا یہ فلسفیانہ بحثیں حکومت کی طرف سے دی گئی ایسی افیون تھی جس کے نشے میں دُھت ہو کر اکثر علماء نے سیاسی، اور معاشرتی امور میں سماج کی رہنمائی کے عظیم کام سیعلحدگی اختیار کرلی۔

حکومت وقت نے آئمہ طاہرینؑ خصوصاً امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے حکیمانہ ،مصلحانہ اور معرفت انگیز کلام اور خطابت کو اس لائق نہ سمجھا کہ ان کی اسلامی معاشرے میں ترویج کی جائے اور عوام الناس ان سے استفادہ کر سکیں۔ جبکہ حضرت ختمی مرتبتؐ کی وفات کے بعد سے ہی لوگوں کا یہ شعار بن گیا تھا کہ امیر المومنین کے اقوال اور نصائح کو نہایت توجہ سے سنتے اور اسے ذہنوں کے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر لیتے تھے۔ چنانچہ معتبر تاریخی حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کے دور میں سیکڑوں افراد ایسے موجود تھے جنہیں امیر المومنین کے کلام اور خطبات کا ایک بڑا حصہ زبانی یاد تھا۔ پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں قرآن کے بعد جو عربی نثر ملتی ہے وہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی ہے۔ یہ نثر خطابت اور رسائل کی شکل میں نہج البلاغہ کی تدوین سے کئی سو سال پہلے کی سنی اور شیعی کتابوں میں بکھری ہوئی ملتی ہے۔ علماء اور محدثین اور عربی ادب کے ماہرین ان سے واقف تھے۔ سید رضی نے چوتھی صدی ہجری میں کلام امیر المومنین کو نہج البلاغہ کے نام سے جمع کیا۔ یہ کتاب اپنے گوناگوں موضوعات اور ان کی گہرائی اور گیرائی کے معاملے میں معجزات کے حدود کو چھوتی ہے۔ بلاشبہ امیر المومنین کے افکار اور نظریات نے وہ بنیاد فراہم کی جس کے اوپر اسلامی فلسفے اور عرفان کی وہ بلند اور عالیشان عمارت کھڑی ہو سکی جس پر آج ہر مسلمان فخر کرتا ہے۔ مابعد الطبیعات اور الٰہیاتی فکر کو

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جس نہج پر ڈالا تھا اسی پر چل کر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے عرفانی اور متصوفانہ نظریات کی تشکیل ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ عصری تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ان نظریات کی تفصیل میں یونانی اور اشراقی فلسفے کی مصطلحات داخل ہو گئیں، یہ بات بلا سبب نہیں ہے کہ نقشبندی سلسلہ کو چھوڑ کر اسلامی تصوف کے تمام سلسلے اپنا آغاز علیؑ مرتضیٰ سے کرتے ہیں۔

یہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کی آواز ہے کہ دین کا نقطۂ آغاز خدائے وحدہ لاشریک کی معرفت ہے۔ یہ جملہ ان تمام لوگوں کے ذہنوں کو جھنجوڑ دینے کے لئے کافی ہے جو دین کی اساس شریعت کے اصولوں میں، رسوم و روایات میں، یا کسی مبہم عقیدے میں تلاش کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے بیان میں اس اصل اصول پر زور دیا ہے کہ دین کی اساس معرفت الٰہی میں مضمر ہے، جب تک کسی قلب میں خدا کی معرفت جلوہ گر نہیں ہو گی دین کی حقیقت اور اس میں چھپی ہوئی حکمتیں اس پر واضح نہیں ہو سکتیں۔ معرفت رب وہ مضبوط لنگر ہے جو مومنین کے قلوب کو گردش زمانہ کی طوفانی لہروں میں بھی ایمان و یقین پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی خطبے میں معرفت کی بنیادی حیثیت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس کے ضروری ارکان و شرائط بیان فرمائے ہیں اور عموماً انسان جن ناقص مراتب ادراک کو اپنی منزل آخر بنا کر قانع ہو جاتے ہیں، ان کے ناکافی ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ خصوصاً اس جملے میں کہ "کمال توحید اخلاص ہے اور کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے، کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے، اور ہر موصوف شاہد کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے"[۲] یعنی توحید باری تعالیٰ میں ذات اور صفات کی دوئی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی ذات جوہر طول و عرض کا مجموعہ نہیں کہ اس میں صفتیں اس طرح قائم ہوں جس طرح پھول میں خوشبو اور ستاروں میں چمک بلکہ اس کی ذات خود صفتوں کا سرچشمہ ہے اور وہ اپنے کمالات ذاتی کے اظہار کے لئے کسی توسط کی محتاج نہیں ہے۔ صفات الٰہی اس کی عین ذات ہے، یعنی جو ذات ہے وہی صفت ہے اور جو صفت ہے وہی ذات ہے۔ عرفان کی جانب امیر المومنین کے طبعی رجحان کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ نہج البلاغہ میں منقول خطابت میں اکثر مقامات پر آپ کے کلام کی شروعات عرفانی مباحث سے ہوئی ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو "تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس کی ایک صفت سے دوسری کو

تقدیم نہیں کہ وہ آخر ہونے سے پہلے اول اور باطن ہونے سے قبل ظاہر ہو، اللہ کے علاوہ جسے بھی ایک کہا جائیگا، وہ قلت اور کمی (کے معنی) میں ہوگا" ۳ یا دوسرے مقام پر فرمایا "تمام حمد اس اللہ کے لئے جو چھپی ہوئی چیزوں کی گہرائی میں اترا ہوا ہے، اس کے ظاہر و ھویدا ہونے کی نشانیاں اس کے وجود کا پتہ دیتی ہیں، گو دیکھنے والے کی آنکھ سے وہ نظر نہیں آتا پھر بھی نہ دیکھنے والی آنکھ اس کا انکار نہیں کر سکتی، اور جس نے اس کا اقرار کیا اس کا دل اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ وہ اتنا بلند و برتر ہے کہ کوئی چیز اس سے بلند تر نہیں ہو سکتی اور اتنا قریب ہے کہ کوئی شئے اس سے زیادہ قریب نہیں ہے .... وہ ذات ایسی ہے کہ جس کے نشانات اس طرح اس کی شہادت دیتے ہیں کہ انکار کرنے والے کا دل بھی اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ ان لوگوں کی باتوں سے بہت بلند و برتر ہے جو مخلوقات سے اس کی تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں" ۴

عرفان اور فلسفہ کے میدانوں میں ہم نہج البلاغہ کو اتنا آگے پاتے ہیں کہ اس کا مقابلہ دوسری کتابوں سے کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس میدان میں امیر المومنین سے پہلے اور نہ آپ کے بعد کوئی آپ کی برابری نہیں کر سکا ہے۔ مابعد الطبیعیات اور الٰہی فلسفے کے بیان میں آپ ایسے مقام تک پہنچ گئے ہیں جس کے آگے بڑھنا تو درکنار اس تک رسائی حاصل کرنا بھی اب تک ممکن نہ ہو سکا۔ ذات و صفات الٰہی کے تمام پہلوؤں، مثلاً خدا کی ذات کا ازلی و ابدی ہونا، اس کی وحدانیت کا عددی نہ ہونا۔ اس کا اول و آخر، ظاہر و باطن ہونا، نیز اس کا قادر مطلق اور خالق مطلق ہونا وغیرہ کا اس طرح احاطہ کیا ہے جس کی نظیر کسی دوسرے اسلامی یا غیر اسلامی ماخذ میں ہرگز نہیں ملتی چنانچہ اپنے دوسرے خطبے میں وہ ارشاد فرماتے ہیں "حمد اس خدا کی ہے جس کی ذات کی دلیل کائنات ہے اور اس کی مخلوقات کا حادث ہونا اس کی ازلیت کی دلیل ہے، اور اس کی مخلوق کا ایک دوسرے کے مانند ہونا اس کے بے مانند ہونے کی دلیل ہے۔ وہ حواس خمسہ سے پوشیدہ ہے اور حواس کے ہاتھ اس کے دامن کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اسکے باوجود وہ ظاہر ہے اور کوئی چیز اس کے وجود کو چھپا نہیں سکتی" ۵

ایک چھوٹے سے مقالے میں نہج البلاغہ کے کسی ایک پہلو کا احاطہ بھی ناممکن ہے، خاص طور پر عرفانی اور الٰہیاتی پہلو جو کہ امیر المومنین کے پسندیدہ ترین موضوعات میں سے ایک ہے، اس

پہلو پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے یقیناً دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ یہاں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ خطبات میں فکری اور عرفانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ عوام الناس کو بھی اس جانب رغبت دلائی ہے۔ نہج البلاغہ میں ایسے اقوال کی کمی نہیں ہے جن میں آپ نے لوگوں کو تفکر، تعقل اور تفقہ کی جانب دعوت دی ہے۔ آپ نے عقل ودانش کو اسلام کا ایک مضبوط ستون قرار دیا ہے ارشاد فرماتے ہیں "خدا رحمت کرے اس شخص پر جو فکر سے کام لیتا ہے اور عبرت حاصل کر کے بینا ہوتا ہے۔"[۶] بصیر و بینا وہ شخص ہے جو سنتا ہے اور فکر کرتا ہے، دیکھتا ہے اور عبرت حاصل کرتا ہے اور عبرت سے نفع اٹھاتا ہے۔"[۷]

"کہاں ہیں وہ عقلیں جو چراغ علم وہدایت سے روشن ہیں، وہ آنکھیں جن میں تقویٰ وپرہیزگاری چمکتی ہے"

وہ شئے جو نہج البلاغہ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے فلسفے اور افکار کو دوسرے فلسفیانہ افکار سے الگ کرتی ہے وہ عقل اور تزکیۂ قلب کا ایک خاص امتزاج اور ان کی باہمی ہم آہنگی ہے۔ امیر المومنین کے مطابق عقلی اور ذہنی موشگافیاں اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک ان کے ساتھ تزکیۂ نفس اور تزکیہ قلب کا شوق بھی شامل نہ ہو۔ جو فلسفہ ذہن سے شروع ہو کر اس کی پر پیچ راہوں میں گھٹ کر دم توڑ دے، تو ایسا فلسفہ کسی مفکر کے لئے ذہنی غذا کا کام تو کر سکتا ہے، لیکن سماج میں کسی اصلاح کا بیڑا نہیں اٹھا سکتا۔ یونانی فلسفے کی یہی وہ خاصیت تھی جس کی وجہ سے اسے بیرون ملک سے منگا کر اسلامی سماج میں رائج کیا گیا۔ امیر المومنین نہج البلاغہ کی روشنی میں اس نظریہ کے مخالف نظر آتے ہیں۔ آپ کے نزدیک فلسفہ وعرفان بذات خود کوئی گراں قدر وقیمت نہیں رکھتے تاوقتیکہ ان کے ذریعے کسی عملی اور اصلاحی نتیجے پر نہ پہنچا جائے۔ چونکہ آپ کی فکر وحی الٰہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، لہٰذا آپ کے ارشادات تمام مقامات پر آیات قرآن کی تفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں لفظ 'آمنوا' استعمال ہوئی ہے فوراً اس کے پیچھے "عملوا الصالحات" کی تکرار نظر آتی ہے، یہی فکر ہمیں امیر المومنین کے خطبات اور ارشادات کے ذریعہ نہج البلاغہ میں نظر آتی ہے، چنانچہ ایک مقام پر اسلام کی تعریف آپ نے اس انداز میں کی: 'اسلام کے معنی سر تسلیم خم کرنا ہے اور سر تسلیم

جھکانا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعتراف ہے، اور اعتراف فرض کی بجا آوری ہے، اور فرض کی بجا آوری عمل ہے"۸

ہمارے آئمہ طاہرین خصوصاً امیر المومنین حضرت علیؑ نے ہمیشہ اپنی نشستوں میں اپنے صحابہ کے درمیان الٰہیاتی، فلسفیانہ اور عرفانی مباحث کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقتوں کو انکے سامنے واضح فرمایا۔ یہاںتک کہ ہمارے آئمہ کی یہ سنت اہل تشیع کے درمیان رواج پاگئی اور پیروان تشیع، اسلام کے دیگر فرقوں کی بہ نسبت فلسفے اور عرفان کی جانب زیادہ مائل ہوتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں بعد میں شیعوں پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ تفسیر قرآن کے سلسلے میں تاویلیں کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن خود تفکر اور تفلسف کی جانب لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ اہل تشیع اور دیگر اسلامی فرقوں کے درمیان یہ فرق اتنا واضح تھا کہ مورخین کو لکھنا پڑا کہ کہ فلسفے اور عرفان کی جانب شیعوں کا جھکاؤ صدر اسلام سے ہی دوسروں کے مقابلے زیادہ رہا ہے۔ دراصل ہمارا ان علوم کی جانب جھکاؤ ہمارے آئمہ کا پیدا کیا ہوا ہے جو علوم اسلامی کے اصل خزینہ دار تھے اور جنہوں نے اپنے خطبات، تقاریر، اور دعاؤں کے ذریعے ہمیں ان کی تعلیم دی۔ یہ ہمارے آئمہ کا ہی فیضان علم تھا کہ ہمیشہ تعداد کے اعتبار سے اقلیت میں رہتے ہوئے بھی فرقۂ تشیع کا اسلامی علوم کی ترقی اور ترویج میں دوسروں سے کہیں زیادہ حصہ رہا۔

مگر تاریخ کا اس سے بڑا علمیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو فرقہ اپنے آپ کو امیر المومنین اور آئمہ اطہار کا حقیقی پیرو مانتا ہو، آج اس کی حالت ایک پسماندہ اور توھم پرست قوم کی ہو گئی ہے، آج ہم نے اپنے دین کو اوھام اور بے معنی مراسم کی آماجگاہ بنالیا ہے۔ وہ علم جو سرور کائنات کے بعد آئمہ اطہار کے سینہ بہ سینہ ہمارے علماء تک پہنچا، آج ان علوم کے آثار مٹ رہے ہیں اور ہم ایک قوم کی حیثیت سے علم، تحقیق اور عقل سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر پہلو میں پسماندگی نمایاں ہو رہی ہے۔ اس پوری صورت حال میں نہج البلاغہ ایک مظلوم کتاب بن کر رہ گئی ہے جس کے مضامین پر غور کرنا تو درکنار ہم اسے پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے۔ جبکہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں ہم نہج البلاغہ کے ذریعے اسلامی طرز تفکر اور اسلامی نظام حیات کو دنیا کے سامنے پیش کریں، نیز اس کا تحقیقی مطالعہ کر کے اسلامی علوم و حکمت کے نئے ابواب کھولیں،

جب تک ہم اپنی ان پرانی علمی روایات کی جانب رجوع نہیں کریں گے ہمارے مسائل اسی طرح بڑھتے رہیں گے۔

حوالے:

۱۔ اول الدین معرفۃ، نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱
۲۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱
۳۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۶۳
۴۔ نہج البلاغہ خطبہ، نمبر ۴۹
۵۔ نہج البلاغہ خطبہ، نمبر ۱۵۰
۶۔ نہج البلاغہ خطبہ، نمبر ۱۰۳
۷۔ نہج البلاغہ خطبہ، کلمات قصار ۱۲۵
۸۔ نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۲۵

☆☆☆☆☆☆

معراج رسول

کوثر نیازی

جب بھی ذکر علی چھڑ گیا دیکھئے
کفر کا زرد چہرہ ہوا دیکھئے

لیکے محبوب حق کو امیں چل پڑے
جانب صدرۃ المنتہیٰ دیکھئے

دو کماں کا فقط فاصلہ رہ گیا
کتنا نزدیک محبوب تھا دیکھئے

طالب جلوہ موسیٰ گئے طور پر
رب کے مہمان ہیں مصطفیٰ دیکھئے

اُدن منی تھا یا لہجہ مرتضیٰ
سن کے چونکے جسے مصطفیٰ دیکھئے

اسکو معراج کہئے گا یا معجزہ
سچ تو ہے وقت خود رک گیا دیکھئے

دور ہر رجس ان سے ہے حق نے کہا
آپ پڑھ کر حدیث کساء دیکھئے

آپ اپنے سبھی بھول جائیں گے غم
سوچ کر واقعہ کربلا دیکھئے

اب تو کوثر کو بھی بولنا آگیا
ان کی مدحت کا ادنیٰ صلہ دیکھئے

☆☆☆☆☆

عبادت اور دعا کا مہینہ رمضان

دعا، اس کی ضرورت اور قبولیت:
ایک مختصر جائزہ

پروفیسر شاہ وسیم
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جذبات کے بوجھ تلے دبے، کچلے، سہمے اور پریشانیوں کے شکار کسی انسان کے ذہن میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا ایک ایسا فرد جو اپنی ہمت، ولولہ اور زندگی کی تمام تر آرزوئیں اور امیدیں گنوا بیٹھا ہے۔ اسے دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے اور اس کے سامنے طے ہونے والا پر خار و اوبڑ کھابڑ راستہ ہے۔ اور وہ انہیں اندھیروں میں کھویا ہوا ہے منزل کی تلاش میں ذہن مکاوف ہو چکا ہے، ہمت جواب دے چکی ہے اور راہ عمل ہے کہ مفقود۔ لیکن اگر یہ سرگرداں شخص دنیا کے خالق و مالک کی جملہ صفات پر مکمل اعتماد و اعتقاد رکھتا ہے تو اسے زیادہ دیر تک ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ بارگاہ عالیہ الٰہی میں اپنی خطاؤں اور لغزشوں کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت ندامت اور غیر معمولی شرمندگی کے ساتھ دست دعا بلند کر دیتا ہے کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ خداوند عالم کی رحمتوں کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس کی رحمت سے مایوسی کفر سے نزدیک کر دیتی ہے لہذا وہ اس امید کے ساتھ کہ اس کا رب تو اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔" نحن اقرب الیه من حبل الورید" اس سے اپنا درد دل بیان کر دیتا ہے۔ اور مالک کائنات سے اسی رازدارانہ گفتگو کا نام ہے دعا۔

اور اس کا فرمان ہے کہ (اے پیغمبرؐ) جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو کہدو کہ میں تمہارے نزدیک ہوں (اذا سالك عبادی عنی فانی قریب)

اس طرح یہ بات منزل یقین کو پہونچ جاتی ہے کہ جب کوئی مجبور وناتوان انسان جس کی ساری امیدیں خاکستر اور کوشش ناکام ہو جائیں اور کوئی صورت نظر نہ آئے تو اس کے دل سے نکلی ہوئی آواز دعاوالتجا ہوا کرتی ہے اور خالق کے رحم وکرم کی آرزومند ہوتی ہے۔اگر یہ آواز ایمان و عمل کی حامل ہوتی ہے تو شرف قبولیت تک پہونچنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

عبداللہ ابن سنان کا بیان ہے کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ اسلام سے سنا کہ ''دعا کیا کرو کیونکہ وہ خدا کی بخشش کی کنجی ہے اور ہر حاجت تک پہنچنے کے لئے دعا وسیلے کی قوت ہے۔سب نعمتیں اور رحمتیں پروردگار کے پاس ہیں جن تک دعا کے بغیر نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔کسی دروازے کو کھٹکھٹاتے رہو تو بالآخر وہ کھل ہی جائے گا۔''[1]

دعا انسان کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔اس طرح انسان کے لئے اس کے تزکیۂ نفس اور اس کے اعمال افکار کی ضمانت بن کر ابھرتی ہے کیونکہ ہر دعا کرنے والا اپنی لغزشوں پر غور کرتا ہے۔گناہوں کو یاد کر کے توبہ کرتا ہے اور اپنے مالک سے رجوع کر کے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔اس پر،اس کے قرآن اور اہلبیت پر ایمان اور اس سے تمسک کے ساتھ۔

وہ لوگ جو فلسفۂ دعا کو نہیں سمجھتے،ان کا کہنا ہے کہ دعا کرنے سے کیا فائدہ ہے کیونکہ دعا کرنے والا ایک کاہل اور بے عمل انسان بن کر رہ جاتا ہے۔اس طرح ان کے خیال میں دعا ایک فعل عبث ہے اور دعا کرنے والا ایک ناکارہ اور بے مصرف انسان۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو فلسفۂ دعا کو نہیں سمجھتے اور جنہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ جب ذہن پر ہر طرف سے جذبات کی یلغار ہو اور ان کا بوجھ دل وجان پر بھاری پڑ رہا ہو تو قوت عمل اور فکر سبھی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ایسے میں اگر کوئی ہمدم، اور حسن سلوک سے پیش آنے والا کوئی ایسا ساتھی مل جائے جس سے سب کچھ کہا جاسکے تو ذہن ودل پر چھایا ہوا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔LETTING OFF THE STEAM کا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے اور انسان کو سکون نصیب ہوتا ہے کیونکہ اس کا ذہن ودل گھٹن سے آزاد ہو جاتے ہیں۔اب افکار عمل کی منزل میں فعالیت اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ تدبر سے کام لیتا ہوا اپنے مسائل کو حل کرنے کی طرف

کامیابی اور اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا گام بہ گام منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

یہی خیال انسان کو منزل دعا تک لے آتا ہے۔ کہنا ہے تو اس سے کیوں نہ کہیں جو اپنے بندوں پر مہربان ہے، راہ نجات دکھانے والا ہے۔ رازوں کو مخفی رکھنے والا اور ساتر العیوب ہے۔ دعا کرو، تضرع وزاری کرو، ذہن و دل سے بوجھ اتر جائے گا۔ سننے والا سنے گا مراد بھی بر آئے گی کہ اسی نے کہا ہے۔

"اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔"

(جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں)

مشہور ماہر نفسیات الیکزکارل (ALEXIS CARREL) کہتا ہے کہ

"... دعا اطمینان پیدا کرتی ہے۔ یہ انسان کی فکر میں ایک طرح کی شگفتگی پیدا کرتی ہے اور باطنی انبساط کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات یہ انسان کے لئے بہادری اور دلاوری کی روح کی بیداری

> **نگاہ کی پاکیزگی، کردار کی متانت، باطنی انبساط اور مسرت، پر اعتماد چہرہ، استعداد ہدایت اور استقلال حوادث، سب دعا کے مظہر ہیں**

کے لئے تحریک کا کام بھی دیتی ہے۔ دعا کے ذریعے انسان پر بہت سی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ نگاہ کی پاکیزگی، کردار کی متانت، باطنی انبساط اور مسرت، پر اعتماد چہرہ، استعداد ہدایت اور استقلال حوادث، سب کے مظہر ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جو دعا کرنے والے کی روح کی گہرائی اور جسم میں چھپے ہوئے ایک خزانے کی ہمیں خبر دیتی ہیں۔ دعا کی قدرت سے پسماندہ اور کچلے ہوئے لوگ بھی اپنی عقل اور اخلاقی قوت کو بہتر طریقے سے کار آمد بنا لیتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔"[۲]

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دعا کس لئے کی جائے کیونکہ (معاذ اللہ) یہ دعا خدا کے کاموں اور اس کے فیصلوں میں مداخلت کے مترادف ہے۔ وہ قدرت والا ہے، ہم سب اس کی مخلوق ہیں، اس کے بندے ہیں۔ وہ ہمارے تمام خیالات اور احوال سے باخبر ہے۔ جو چاہے گا اس کا حکم دے گا۔ ہم اس کے کام میں دخل انداز کیوں ہوں؟ ہمیں تو سر تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور راضی

بہ رضا رہنے کی! جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ عبد و معبود کے رشتے کو اصلاً سمجھتے ہی نہیں کیونکہ جیسا کہ امام جعفر الصادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ خدا کے یہاں ایسے مقامات اور ایسی منازل ہیں جو مانگے بغیر نہیں ملا کرتیں (ان عند الله عزوجل منزلة لا تنال الا بمسالة)۳۔ پھر یہ کہ اگر اپنے رب سے نہ کہو گے تو کس سے کہو گے؟ دعا انسان کو ایسی عظیم و لامتناہی قوت سے متصل کر دیتی ہے، جس نے کائنات کی ہر شے کو ایک دوسرے سے چاروں طرف سے مربوط کر دیا ہے۔ جب راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو جائے، گھپ اندھیر آن گھیرے اور ظاہری اسباب مفقود ہو جائیں تو دل و ذہن انسانی کو کس طرف متوجہ کرتا ہے؟

ایسے میں ہر شخص کسی غیبی طاقت سے مدد مانگتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء (کون ہے جو کسی مصیبت زدہ اور بے قرار کی دعا کو سنتا ہے اور اس کی فریاد رسی کر کے اسے مصیبت سے نجات دلاتا ہے؟)

اس طرح یہ بات سمجھ میں آجانی چاہئے کہ دعا قلب مضطر کی آواز ہے، اس سے رجوع کی علامت ہے، اس سے جو رؤف و کریم، و رحمٰن رحیم ہے۔ ساتھ ہی دعا ایک متحرک انسان کے دل کی آواز ہے جو اپنے معبود سے رجوع کرنے والے کا مظاہرہ ہے۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ (جیسا کہ مولائے کائنات حضرت علیؑ کا ارشاد ہے) عمل کے بغیر دعا کرنے والا بغیر کمان کے تیر چلانے والے کے مانند ہے (الداعی بلا عمل کالرامی بلاوتر)

ماہر نفسیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

"دعا اور دین پر محکم ایمان، اضطراب، تشویش، ہیجان اور خوف کو دور کر دیتے ہیں جو ہمارے دکھ درد کا آدھے سے زیادہ حصہ ہیں" (آئین زندگی ص ۱۵۲)

ولیم چٹک (WILLIAM CHITTICK) جنہوں نے صحیفۂ سجادیہ کا ترجمہ کیا ہے اپنے لکھے ہوئے ضمیمہ میں کہتے ہیں:

"اسلامی ضمن میں دعا (دراصل) ایک بنیادی خاکہ کی طرح نظر آتی ہے (ایک ایسا خاکہ) جس کے اندر روح کو عین مطابق منشائے الٰہی ڈھالا جاسکتا ہے اور جس کے وسیلہ سے ہر طرح کے ان

افکار اور نظریات سے جو "انا" کے محور پر (پہنچتے) ہوں، چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

دعا کس طرح کی جائے؟

دعا کا طریقہ کیا ہونا چاہئے، امام جعفر الصادق علیہ السلام کے مندرجہ ذیل بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔"

"جب تم میں سے کوئی اپنے رب سے دنیا و آخرت کی کوئی حاجت طلب کرنا چاہے تو پہلے خدا کی حمد و ثنا اور مدح کرے، پیغمبرؐ اور ان کی آل پر درود بھیجے، پھر گناہوں کا اعتراف کرے اور اس کے بعد سوال کرے"۔[۴]

آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ جو چاہتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو (تو) اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی غذا اور کسب و کار پاک اور پاکیزہ ہو۔[۵]

برکت اور دعا کا مہینہ رمضان

ماہ مبارک رمضان نماز اور روزہ کی تمام برکتیں ایک ساتھ لئے ہوئے آتا ہے۔ یہ عبادت کا مہینہ ہے۔ توبہ اور زاری کا مہینہ ہے اور دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اے لوگو! خدا کی برکت، بخشش اور رحمت کا مہینہ تمہاری جانب آرہا ہے۔ یہ مہینہ تمام مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے دن دوسرے مہینوں کے دنوں سے، اور اس کی راتیں دوسرے مہینوں کی راتوں سے بہتر ہیں۔ اس ماہ کے لمحے اور گھڑیاں دوسرے مہینوں کے لمحوں اور گھڑیوں سے بہتر ہیں۔"

"یہ ایسا مہینہ ہے جس میں تمہیں خدا نے مہمان بننے کی دعوت دی ہے اور تمہیں ان لوگوں میں سے قرار دیا ہے جو خدا کے اکرام و احترام کے زیر نظر ہیں۔ اس میں تمہاری سانسیں تسبیح کی مانند ہیں، تمہارا سونا عبادت ہے اور تمہارے اعمال اور دعائیں مستجاب ہیں۔ لہذا خالص نیتوں اور پاک دلوں کے ساتھ خدا سے دعا کرو تاکہ وہ تمہیں روزہ رکھنے اور تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرمائے... اس ماہ میں اپنی بھوک اور پیاس کے ذریعہ قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔ اپنے فقراء اور مساکین پر احسان کرو۔ اپنے بڑے اور بوڑھوں کا احترام کرو اور چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ رشتہ داری کے ناتوں کو

جوڑدو۔ اپنی زبانیں گناہ سے روکے رکھو۔ اپنی آنکھیں ان چیزوں کے دیکھنے سے بند رکھو جن کا دیکھنا حلال نہیں ۔ اپنے کانوں کو ان چیزوں کے سننے سے روکے رکھو جن کا سننا حرام ہے۔ اور لوگوں کے یتیموں پر شفقت و مہربانی کرو تاکہ وہ بھی تمہارے یتیموں سے یہی سلوک کریں۔"

مندرجہ بالا باتوں کا ذکر امام زین العابدین علیہ السلام کی اس دعا میں بھی موجود ہے جسے آپ رمضان کا مہینہ آتا تھا' تو پڑھا کرتے تھے۔ اس دعا میں حمد خدا' ذکر پیغمبر اکرمؐ محمد مصطفے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ' خدا کی دی ہوئی نعمتوں، قرآن اور دین کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ ماہ مبارک کی برکتوں' محرمات' خدا کی خوشنودی کے عمل' اور انحراف سے بچنے کے لئے اس کی مدد، اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں میں اضافہ کے لئے دعا اور طلب مدد کا ذکر سمویا ہوا ہے۔ اسی دعا میں آپ کہتے تھے۔

"ساری حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے مہینوں کی شاہراہ پر اپنے مہینے (رمضان) کو مقرر کیا۔

رمضان المبارک کا مہینہ۔

روزے کا مہینہ

اسلام (سپردگی) کا مہینہ

پاکیزگی کا مہینہ

آزمائش کا مہینہ

قیام (عبادت و نماز) کا مہینہ

(وہ مہینہ) جس میں اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے قرآن نازل فرمایا جو ہدایت اور (نیکی اور بدی میں) کھلے فرق کی نشانیاں (لے کر آیا) ہے۔

(بارالہا) اس ماہ میں (ہمیں) کامیابی سے ہمکنار کر کہ

ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ نیکی کر کے اور تحائف دے کر رشتے استوار کریں۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں اور انہیں عطیہ دیں۔

اپنے مال و متاع سے حقوق کی ادائیگی کریں

اور خیرات کر کے انہیں خالص بنائیں۔

جو ہمیں چھوڑ بیٹھے ہیں ان تک ہم (خود) جائیں۔
جس نے ہمیں نقصان پہونچایا ہے اس کے ساتھ عدل کریں
جس نے ہم سے دشمنی کی ہے اس سے امن قائم کریں:
مگر اس سے نہیں جو تجھ سے اور تیری وجہ سے دشمنی رکھتا ہے
کیونکہ یہ وہ دشمن ہے جس سے ہم دوستی نہیں رکھ سکتے،
یہ وہ حزب ہے جسے ہم دوست نہیں رکھیں گے۔
اور (ہم) تجھ سے قربت کے خواہاں ہیں ان پاک اعمال کے ذریعہ سے جو ہمیں گناہوں سے پاک کرے گا۔

اور بداعمالیوں کے مکر رسزاوار ہونے سے بچائے گا...

آیئے اس ماہ میں ہم یہ دعا کریں کہ خدایا اپنے بندوں پر رحم فرما اور دنیا میں امن وامان برپا فرما تاکہ تیرے بندے ایک ہی خاندان کے فرد بن کر صلح وآشتی اور حق وعدل اور انصاف کے ساتھ زندگی بس کر سکیں۔

کسی نے حضرت علی علیہ السلام سے دعا قبول نہ ہونے کی بات کہی تو آپ نے فرمایا:

تمہارے دل ودماغ نے آٹھ چیزوں میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے تمہاری دعا قبول نہیں ہوتی:

۱۔ تم نے خدا کو پہچانا مگر اس کا حق ادا نہیں کیا۔...
۲۔ تم اس کے پیغمبرؐ پر ایمان تو لے آئے ہو مگر اسکی سنت کی مخالفت کرتے ہو...
۳۔ اس کی کتاب کو تو پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے ہو..
۴۔ تم شوق جنت کو تو بیان کرتے ہو مگر تمہارے کام ایسے ہیں جو تمہیں اس سے دور لے جاتے ہیں۔
۵۔ تم کہتے ہو کہ تم خدا کے عذاب سے ڈرتے ہو مگر اس کے باوجود اس کی نافرمانیوں کی طرف بڑھ جاتے ہو...
۶۔ خدا کی نعمتوں کو تو کھاتے ہو مگر اس کے شکر کا حق ادا نہیں کرتے ہو...

۷۔اس نے تمہیں شیطان سے دشمنی رکھنے کا حکم دیا مگر تم اس سے دوستی رکھتے ہو۔
۸۔لوگوں کے عیوب (بیان کرنے) کو تم نے اپنا نصب العین بنالیا ہے اور اپنے عیوب پس پشت ڈال دیئے ہیں"[۴]

اس طرح اگر ہم فلسفۂ دعا پر غور کریں اور اس کے نفسیاتی پہلو کو مد نظر رکھیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ "دعا دل میں چراغ امید روشن کر دیتی ہے۔ جو لوگ دعا کو فراموش کئے ہوئے ہیں' وہ نفسیاتی اور اجتماعی طور پر ناپسندیدہ عکس العمل سے دوچار ہوتے ہیں" اور یہ کہ "کسی قوم میں دعا اور زاری کا فقدان اس ملت کی تباہی کے برابر ہے۔ وہ قوم جو احتیاج دعا کا گلہ گھونٹ دے وہ عموماً فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

دعا ایک طرح کی عبادت کی راہ ہے۔ — خضوع و خشوع و بندگی ہے
اور اپنے خالق سے وابستگی — وہ جو سمیع و بصیر ہے
دلوں کا حال جانتا ہے — مانگنے والوں کی آواز کو قبولیت بخشتا ہے
وہ جو رحمٰن اور رحیم ہے، — سارے عالمین کا رب۔

حوالے:

۱۔اصول کافی جلد ۲ ص۔ ۴۶۸
۲۔مؤلف انسان موجود ناشناستہ'
۳۔اصول کافی، جلد ۲، ص۔ ۳۴۸
۴۔سفینۃ البحار، جلد ۱، ص۔ ۴۴۸
۵۔ایضاً ص۔ ۴۴۹
۶۔ایضاً، ص ص۔ ۴۴۸۔۴۴۹

☆☆☆☆

ایران کا فنِ تعمیر

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ہزار سال قبل

شہر شوش کے شمال مغرب میں تپہ مَوسیان نامی مقام پر جو ستون دریافت ہوا ہے اس کی بنیاد پر ماہرین آثار قدیمہ اس رائے کے حامی ہیں کہ ایران میں عمارتوں کی تعمیر میں تقریباً چھ ہزار سال قبل ستونوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس ملک کی اہم ترین عمارت جس کا صدر دالان ستونوں پر قائم تھا۔ شہر نقدہ کے قریب واقع ہے۔ ایران کی قدیم یادگار عمارتوں میں وہ ایلامی مندر بھی شامل ہے جو حضرت

تصویر ایران

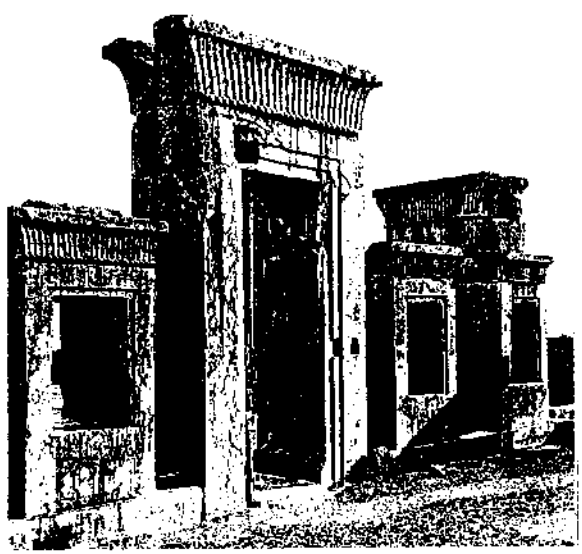

ہخامنشی دور کے نامور بادشاہ داریوش کے محل کے صدر دروازہ کا ایک منظر

عیسیٰؑ کی ولادت سے قبل دو ہزار سال کی مدت کے درمیان کسی وقت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ حسنلو نامی قلعہ بھی ایک محکم عمارت تھی۔ جس میں کمرے، دالان، دہلیزیں صحن اور ستون وغیرہ اصول فن معماری کے مطابق پتھر، چونے کچی اور پکی اینٹوں سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے تقریباً نو سو سال قبل بنائے گئے تھے اور اس کا شمار اس عہد کی قابل ذکر عمارتوں میں ہوتا تھا۔

ماد خاندان کے عہد کی قبریں اور سرداب

حسنلو قلعہ کے بعد ستون دار عمارت کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ان مقبروں کی جانب رجوع کرنا چاہئے جو پہاڑوں کو کاٹ کر ان کے اندر بنائے گئے ہیں کیوں کہ ان میں سے بعض ماد خاندان کے عہد کی یادگار ہیں (یہ خاندان حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے قبل آٹھویں صدی کے اواخر میں ایران پر حکمراں تھا) اور یہ عمارتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس خاندان کے فرمانروا شاندار عمارات کی طرز تعمیر سے بخوبی واقف تھے، اس دور کی عمارات میں ستونوں کا استعمال عام تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر ان میں جو سرداب بنائے گئے ہیں ان کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے دہانے پر جو دالان بنائے گئے ہیں وہ ستونوں پر قائم ہیں اگرچہ انہیں پہاڑ کاٹ کر ان کے اندر بنایا گیا ہے۔ چوبی عمارات کی تعمیر کا اہم ترین مآخذ یہی سنگی سرداب ہیں۔ اگرچہ اس زمانے کی کوئی چوبی عمارت تو اب تک دریافت نہیں ہوئی مگر بعد کے ادوار میں جو چوبی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں ان میں نقش و نگار کی وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو ان سردابوں کا خاصہ رہی ہیں۔ بیشتر سردابوں میں عام نقش و نگاری کے ساتھ ہی وہ برجستہ نقوش بھی پائے جاتے ہیں جن میں رسومات عبادت کے مناظر پیش کئے گئے ہیں

ماد خاندان کے بادشاہ اصول شہر سازی سے بھی خوب واقف تھے۔ یونانی مورخ ہردوت حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے قبل وہ باد حکومت کے پایتخت ہگمتانہ (موجودہ ہمدان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس شہر کی تعمیر میں اصول شہر سازی کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ لکھتا ہے کہ شاہی محل کی عمارت بہت محکم مگر بہت عجیب ہے۔ یہ سات قلعوں پر مشتمل ہے جن میں ہر قلعہ دوسرے قلعے کے اندر بنا ہوا ہے جن میں ہر قلعے کے اندر باہر کی جانب کنگورے سفید، سیاہ، نارنجی، نیلے، سرخ سنہری اور روپہلی)

رنگوں کے بنائے گئے ہیں۔ شاہی محل جو بہت بلندی پر بنایا گیا ہے اور سرکاری خزانہ آخری قلعہ کی حدود میں ہے۔

صوبہ ہمدان میں ہی ۱۹۶۷ء کے دوران مادخاندان کے عہد کی دیگر عمارت دریافت کی گئی۔ جو آتشکدے، ایوان، ستون دار دالان، مرکزی عبادت گاہ، کمروں، ذخیروں سرنگوں اور قلعے کی دیواروں پر مشتمل ہے۔

ہخامنشی دور کی معماری

ایران کے فنون لطیفہ کی تاریخ میں ہخامنشی عہد کی معماری فنکاری کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس دور کے فنکاروں نے حکومت کے مراکز اور جتنے بھی پایتخت رہے ان میں ایسے محکم محلات تعمیر کیے کہ ڈھائی ہزار سال گذرنے کے بعد آج بھی وہ اپنی پوری دل کشی و زیبائی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہ عمارات بھی ستونوں پر مشتمل ہیں جن کے سروں پر شیر، گھوڑے، سانڈ، عقاب وغیرہ کے مجسمے نصب ہیں۔ ان کے علاوہ ان پر ایسے بھی مجسمے دکھائے گئے ہیں جن کا سر تو انسان کا ہے اور جسم سانڈ کا، یا انسان کے جسم پر عقاب کے پر لگے ہوئے ہیں اور سر انسان کا ہے اور کان گائے کے۔ ستونوں پر (کھیرے، ککڑی جیسی) پھانکیں، ان کی اونچائی اور زیبائی آنکھوں کو دعوت نظارہ دیتی ہے۔ اس دور کی عمارات میں قابل ذکر شاہی محلات مقابر اور آتشکدے ہیں۔

پاسارگاد شہر میں جو عمارات پائی گئی ہیں وہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پانچ سو پچاس سال قبل کوروش بادشاہ کے حکم سے تعمیر کی گئی تھیں۔ وسیع محلات جو ایک بہت کشادہ چبوترہ پر تعمیر کیے گئے ہیں دیوان عام، دیوان خاص اور مشرقی محل کے نام سے مشہور ہیں۔ مشرقی محل کا جو دروازہ پاسارگاد کے نام سے بھی مشہور ہے کبھی مرکزی ایوان تھا، جس میں آٹھ بلند ستون دو قطاروں میں بنے ہوئے تھے اور ان پر چوبی چھت قائم تھی۔ اب ان میں سے ایک ہی باقی رہ گیا ہے جس پر ایسے انسان کا مجسمہ کندہ ہے جس کے چار شہپر دکھائے گئے ہیں۔ شاید ہخامنشی دور کی ہی وہ قدیم ترین یادگار ہے جو کوروش کے عہد سے اب تک باقی چلی آرہی ہے۔ پاسارگاد کے بعد ہخامنشی دور کی زیباترین پتھروں پر نقاشی کرمانشاہ شہر

کے ایوان بیستون میں دیکھی جاسکتی ہے جس زمانے میں پاسارگاد ہخامنشی خاندان کا پایہ تخت تھا، داریوش بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ شہر شوش کو دارالحکومت قرار دیا جائے جس کی تعمیر میں بابلی، مادی، لیدی و قصری معماروں اور فنکاروں نے اپنی فنکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

تخت جمشید چبوترے کے محلات ہخامنشی خاندان کے بادشاہ داریوش کے زمانے میں کوہ رحمت نامی پہاڑ کے دامن پر منطقہ فارس میں تعمیر کئے گئے تھے، یہ وہ وسیع و عریض عمارت ہے جس کے ہر محل میں اختراع و جدت پسندی کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا اس عظیم الشان عمارت کی تکمیل میں داریوش بادشاہ کے بعد تقریباً سب ہی حکمرانوں نے حصہ لیا۔ جو محلات یہاں دریافت کئے ہیں ان میں ایک آپادیا محل ہے جو یار عام کیلئے مخصوص تھا اور جس میں خصوصی مہمانوں کی پذیرائی کی جاتی تھی۔ یہ محل داریوش اول نے بنوایا تھا۔ کاخ صد ستون (سو ستونوں کا محل) مربع شکل کا تھا اور تخت جمشید کے شمالی حصے میں بنایا گیا تھا۔ کاخ سہ دروازہ (تین دروازوں کا محل) ایوان مشاورت کے نام سے مشہور تھا، یہ ان عمارات کے درمیان واقع تھا جو تخت جمشید چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ تچر محل، وہ دل کش عمارت ہے جہاں داریوش بادشاہ موسم سرما میں رہا کرتا تھا۔ تخت جمشید کی دیگر عمارات کے بر خلاف اس محل کا رخ جنوب کی جانب رکھا گیا ہے تاکہ سورج کی تمازت پورے محل کو گرمی پہنچا سکے۔

ہدیش محل

یہ کبھی خشایار شاہ کا محل تھا۔ اس کا مرکزی مربع شکل کا ایوان چھتیس ستونوں پر قائم تھا۔ اس کے سامنے ہی دوسرا ایوان تھا جس میں چھ ستون دو قطاروں میں نصب کئے گئے تھے۔ اس محل میں چوں کہ چوبی ستون استعمال کئے گئے تھے اسی لئے وقت گذرنے کے ساتھ وہ تو ختم ہوگئے البتہ ان کے سنگی پائے باقی رہ گئے ہیں۔

خزانہ محل

یہ مربع و مستطیل عمارت ہے۔ اس میں کئی ستون دار ایوان ہیں جن کی چھت چوبی ستونوں پر قائم تھی اور اسے تخت جمشید چبوترے کے جنوب میں بنایا گیا تھا۔

مذکورہ بالا عمارات کے علاوہ تخت جمشید چبوترے پر دیگر عمارات بھی ہیں جن میں غالباً فوج رہتی تھی۔ تخت گاہ کے اطراف میں ایک دیوار ہے جو چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے جس میں مناسب جگہوں پر برج بھی تھے۔ دیواریں پتھر اچھی طرح تراش کر چنے گئے ہیں مگر ان میں مصالحے کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ انہیں لوہے کی پاموں سے جوڑا گیا ہے۔ چبوترے تک جانے کے لئے ایک سو دس سیڑھیاں، دو قطاروں میں بنائی گئی ہیں جن پر آسانی سے اترا اور چڑھا جا سکتا ہے۔

تخت جمشید کے محلات کی ایک خوبی یہاں کے نقش و نگار ہیں جن میں جشن نوروز اور درباری مراسم کے مناظر کندہ کئے گئے ہیں۔ مختلف اقوام کے نمائندے تحفے اور نذرانے لئے پورے وقار کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پہنچ رہے ہیں۔ پس منظر میں گل بابونہ اور سرو کے درخت نمایاں ہیں۔ ان پر جستہ نقوش کندہ ہیں۔ ہخامنشی خاندان کے بادشاہوں کا وہ کتبہ یہاں قابل ذکر ہے جو کرمانشاہ کے نزدیک واقع بیستون نامی عمارت میں نصب ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ داریوش بادشاہ کس طرح اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں حالات پر قابو پا رہا ہے۔ اس بادشاہ کا پیکر جن دوسرے بارہ درباری امراء کے ساتھ کندہ کیا گیا ہے ان کے مقابل اس کا قد و قامت زیادہ برجستہ اور نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اشکانی اور ساسانی دور کی معماری

اشکانی یا پارتی خاندان کے حکمرانوں نے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تقریباً دو سو پچاس سال قبل ایران میں اقتدار حاصل کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں وہ یونانی فنون لطیفہ کی پیروی کرتے تھے مگر کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ایران کی قومی و روایتی فن تعمیر کی جانب مائل ہو گئے۔ ان تعمیرات کا انحصار ان کی خیمہ نشین زندگی پر ہے۔ یعنی ایک مرکزی چہار گوشہ صحن اور اس کے اطراف میں دالان۔ چنانچہ فن تعمیر کی یہی وہ خصوصیت ہے جو ایران سے ماوراء النہر لے جائی گئی۔ اس فن تعمیر میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کا مشاہدہ اسلامی عہد کی فن تعمیر اور بالخصوص سلجوقی خاندان کے دور حکومت میں کیا جا سکتا ہے۔

اشکانی خاندان کے حکمرانوں کو جیسے ہی عروج حاصل ہوا انہوں نے فن تعمیر، بالخصوص عمارات کے چہرے کی زیبائی کی جانب بیشتر توجہ دی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ دیواروں کو جس قدر ممکن ہو سکے دیدہ زیب بنایا جائے۔ جب اس فن میں توسیع ہوئی تو نقش و نگار کے ساتھ چہرے کی آستر

کاری پر برجستہ نقوش بھی بنائے جانے لگے۔ جس کا بہترین نمونہ صوبہ سیستان کی ہامون جھیل میں واقع کوہ خواجہ نامی معبد میں دریافت ہوا ہے۔ اشکانی دور کی تعمیرات میں نیم دائرہ محرابوں اور پتھروں کے جوڑوں کو ملانے کے لئے چکنے پتھر کی بنی کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ زیب وزینت کے لئے برجستہ نقوش بھی بنائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ستون پر گہری دھاریاں بھی تراش کر بنائی جاتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس دور کی فن معماری دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ ہاز لطیفی اور ساسانی ادوار میں بھی منتقل ہوئی۔ یہاں یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ شاید محراب دار یا لداؤ کی چھت (جو ایران میں بہت مقبول و معروف ہے) کی تاریخ اشکانی دور سے شروع اور ساسانی دور میں تکمیل پذیر ہوئی۔

پارتی اور ساسانی طرز معماری پر جو عمارات بنائی گئیں ان میں بنیادی طور پر ایسی ہم آہنگی اور ہم بستگی پائی جاتی ہے کہ ماہرین فن تعمیر ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ عمارات کس دور کی ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر تیسفون میں واقع کاخ مداین (مدائین محل) کو ہی لے لیجئے۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جاسکا ہے۔ تاریخی پہلو سے قطع نظر، ساسانی اور اشکانی طرز تعمیر اس قدر مشابہ ہے کہ اس کے بارے میں بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سکونت پذیر صاحبان اقتدار تو بدل گئے مگر طرز تعمیر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

ساسانی خاندان کے حکمران صوبہ پارس کے باشندے تھے اور خود کو ہخامنشی خاندان کا وارث و جانشین کہتے تھے۔ انہوں نے دین زرتشت کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی، اور فنون لطیفہ میں وہ جدت و ندرت پیدا کی کہ جس کا شمار رومی اور ہاز لطیفی فنون لطیفہ کے ہم پلہ و برابر کیا جانے لگا اور کہیں کہیں تو ان پر بھی سبقت لے گیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ عربوں کی فتوحات کے بعد جن فنون لطیفہ کو اسلامی فنون لطیفہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ان پر ساسانی محراب کا گہرا اثر ہے۔

مربع شکل عمارت پر محراب بنانے کا ہنر ساسانی عہد حکومت سے ہی ایرانی اور مغربی فن تعمیر میں منتقل ہوا۔ اس دور کے معماروں کو اس امر پر دسترس حاصل تھی کہ کس طرح چہار دیواری فضا کے درمیان وسیع عریض خالی جگہ پر چھت بنائی جائے۔ ساسانی عہد کے بعض فنی اصول نے یورپ میں

نوکدار محراب کے لئے راہ ہموار کی۔ ہمارات کے درمیان باہمی ربط ویگانگی اس دور کے فن معماری کا خاصہ ہے۔ پوری عمارت کی بنیاد گنبد پر قائم کی جاتی تھی جس کے گرداگرد دالان، حجرے، حجرہ نما کمرے اور نیم دائرہ نما محرابیں وغیرہ کی تعمیر ہوتی تھی۔

چونے کے آستر پر نقش کا کام، لعابی خشتکاری اور دیواروں کی نقاشی ساسانی عہد کی عمارات کی آرائش وزیبائش میں شامل ہیں۔ اس دور کے فنون لطیفہ میں جو تنوع نظر آتا ہے وہ ہمسایہ ممالک کے فن کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ فیروز آباد محل میں جو لعابی خشتکاری کے ذریعے تصاویر منقش کی گئی ہیں اس میں اہل روم کی طرز روش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن بعض جگہ ان ہی خشت پاروں پر ایسی ابھی تصاویر نظر آتی ہیں جن میں مولود بچوں اور انسانوں کے نقوش میں خالص ایرانی اسلوب کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس دور کی دوسری آرائش وزیبائش میں قابل ذکر فن سنگتراشی ہے جو لطافت ونفاست کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ چنانچہ کرمانشاہ شہر میں واقع طاق بستان اور نقش رستم نامی عمارات کے نقوش اس دور کا شاہکار نمونہ پیش کرتی ہیں۔

مجموعی طور پر ساسانی عہد کا فن معماری روایتی فن تعمیر اور مرکزی ومشرقی ایران کی خشک، آب وہوا کے باعث معرض وجود میں آیا۔ چنانچہ اس عہد کی عمارات میں خواہ وہ شاہی محل ہوں یا آتشکدے یا گنبد نما عمارات یا چار ضربی محرابوں پر قائم ایوان ودالان اور وہ چوبرجیاں جو صرف آتشکدوں کے لئے ہی مخصوص تھیں اس دور کے مروج اصول فن تعمیر پر ہی قائم ہیں اور یہ حقیقت ان عمارات سے عیاں ہے جو زمانے کی ستمکارانہ تباہی سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ یہاں صرف کاخ فیروز آباد (فیروز آباد محل) صوبہ فارس میں کاخ سروستان بیستیفون میں ایوان مداین، صوبہ خوزستان میں ایوان کرچہ، جیسے محلات اور تہران۔ ورامتن شاہراہ پر واقع آتشکدہ، کاشان میں آتشکدہ نیاسر، تخت سلیمان میں آتشکدہ گشنسب، قصر شیریں عمارت کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی کی حمایت؟!

از: محمد حسن مظفری

تاریخ بشریت میں شائد ہی ایسی کوئی قوم ہو جس نے ملت اسلامیہ فلسطین کی طرح ظلم و بربریت کی چھاؤں میں مظلومانہ زندگی بسر کی ہو۔ فلسطینی عوام کی المناک داستان مظلومیت کی ابتداء تو پانچ دھائی قبل اس وقت ہوئی تھی جب برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت کے نتیجے میں سرزمین فلسطین میں غاصب و نسل پرست صہیونی حکومت اور جغرافیائی اعتبار سے ناپید ملک اسرائیل کی بنیاد رکھی گئی تھی جس نے گذشتہ ایک سال اور حالیہ کچھ ہفتوں کے دوران بے گناہ اور خالی ہاتھ فلسطینی عوام پر اپنے وحشیانہ مظالم کی انتہا کر رکھی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی مختلف قومیں سامراجیت کے چنگل سے نجات و آزادی حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ فقط ہندوستانی عوام ہی نہیں بلکہ مشرق وسطی اور بعض افریقی ممالک کے لوگوں کی آزادی کی لڑائی فیصلہ کن مراحل تک پہونچ رہی تھی اور ایک کے بعد دوسرے ملک کے عوام اپنے ملک کی سرحدوں سے بیرونی طاقتوں کو باہر نکال کر اپنے ہاتھوں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے میں لگے ہوئے تھے اور یوروپی سامراج کی زنجیروں سے چھٹکارا پانے والے لوگ اپنے ملک کی آزادی کا جشن منا رہے تھے لیکن برطانوی سامراج نے اپنے نو آبادیاتی ممالک سے باہر نکلتے وقت جنوبی افریقہ اور موجودہ نامیبیا (Namibia) پر گوری چمڑی والے یوروپی اور مشرق وسطی میں واقع فلسطین پر یوروپی اور امریکی صہیونی یہودی نسل پرستوں اور شدت پسندوں کو مسلط کر دیا۔ نامیبیا کے لوگوں کو بین الاقوامی حمایت کے سایہ میں ۱۹۹۰ء میں ظلم و ناانصافی سے نجات مل گئی۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے مظلوموں کو ان کی مثالی جد و جہد اور عالمی حمایت کے سہارے ۱۹۹۴ء میں گوری چمڑی والوں کے ظالمانہ چنگل سے نجات مل گئی لیکن فلسطینی عوام آج بھی اسرائیلی مظالم کا شکار ہیں اور ان مظلوموں پر بمباری، گولہ باری

اور آتش باری کا وحشیانہ سلسلہ روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے اور ان ظالموں کو یورپ اور امریکہ کی بھر پور حمایت و تائید بھی حاصل ہے اور فلسطینی عوام ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ واقعہ کا حیرت انگیز اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عالمی وسائل ابلاغ عامہ پر مسلط بڑی طاقتیں حملہ آور صہیونیوں کے ظالمانہ حملوں کا مقابلہ کرنے والے فلسطینی مجاہدوں پر دہشت گردی کی مہر چسپاں کرنے پر تلی ہوئی ہیں تاکہ ان کی مظلومیت کی درد بھری آواز بھی دنیا والوں تک نہ پہونچ سکے۔ واضح رہے کہ عالمی وسائل ابلاغ عامہ سے وابستہ ان مغربی عناصر کی ماہرانہ دروغ گوئی کا یہ عالم ہے کہ ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا کر دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ان کی کرشمہ سازی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی دن کو رات اور رات کو دن کہنے سے انکار کر دیتا ہے تو اسے بھی دہشت گرد کہنے میں یہ ذرہ برابر ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے۔ اب اگر اسے اندھیر نگری، چوپٹ راج نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے!

دنیا کے تمام لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل دنیا میں اسرائیل نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا۔ سامراجی ممالک نے یورپ اور امریکہ کے نسل پرست صہیونیوں کی مدد سے فلسطینی سرزمین پر قبضہ کر لیا اور اس ملک کے حقیقی باشندوں کو اس ملک کی سرحدوں سے باہر نکال دیا۔ ان کی زمین جائداد اور گھروں پر قبضہ کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یورپ، امریکہ، روس اور دنیا کے دیگر ممالک سے لائے گئے یہودیوں کو ان اسلامی علاقوں میں آباد کر دیا۔ اور ان میں سے اکثر یہودیوں کے لئے سرزمین فلسطین کے مختلف علاقوں میں نئے نئے شہر بسا دئے۔ پس یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسرائیل ایک خود ساختہ، بناوٹی اور غیر فطری ملک ہے جس کی تشکیل بڑی طاقتوں کی غیر مشروط حمایت و سرپرستی اور عالمی صہیونیت کی ظالمانہ کوششوں کے نتیجے میں عمل میں آئی اور اس ملک کی تشکیل کی خاطر لاکھوں فلسطینی عوام آوارہ وطن ہوگئے اور گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران ہزارہا ہزار افراد نہایت بیرحمی کے ساتھ قتل کر ڈالے گئے جبکہ بین الاقوامی قوانین اور علاقائی و عالمی رائے عامہ ان ظالموں کی ہمیشہ مخالف رہی ہے۔ فلسطینی عوام گذشتہ پچاس برسوں سے بھی زیادہ عرصہ سے اپنے جائز حقوق کی بحالی اور اپنے وطن کی بازیابی کے لئے غاصب صہیونیوں کے خلاف نبرد آزمائی اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں تاکہ وہ اپنے وطن میں اپنی پسند کی حکومت کی تشکیل کر سکیں جبکہ اقوام

متحدہ کے منشور میں دنیا کی تمام قوموں کو اپنی قسمت کے فیصلے کا بھرپور حق حاصل ہے۔ اس تنظیم سے وابستہ دنیا کے تمام ملک اقوام عالم کے اس بنیادی حق کو تسلیم اور اس کی پیروی کو لازم سمجھتے ہیں۔

واضح رہے کہ اقوام متحدہ کی تشکیل کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ یہ تنظیم کے بنیادی اور آئینی اغراض و مقاصد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اقوام عالم کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کرے اور عالمی صلح کو مستحکم بنانے کے لئے لازمی قدم اٹھائے (منشور اقوام متحدہ دفعہ ۱ بند ۲)۔ اس بین الاقوامی بنیادی قانون کے علاوہ گذشتہ چند دہائیوں کے دوران اسرائیلی مظالم کی مذمت اور فلسطینی مظلومین کی حمایت میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بہت سی قرار دادیں بھی پاس کی گئیں۔ موضوع کی مکمل وضاحت کی خاطر ذیل میں اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر A/Res/2649 مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۷۰ء ملاحظہ ہو جس میں حق خود انفصالی پر مشتمل اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ اول پر تاکید کرتے ہوئے خارجی تسلط (alien domination) اور نو آبادیاتی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والی قوموں کو یہ حق فراہم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے آپ کرنے کے لئے آزاد اور خود مختار ہیں۔ اس سلسلے میں ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پاس ہونے والی قرار داد نمبر 2588-B (xxv) کو بھی بطور سند پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس میں سامراجیت کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والے ممالک اور افراد کی آزادی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لازمی اقدام کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۔ یہ قرار داد بیرونی طاقت اور سامراجی نظام کے سایہ میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے اور اپنی ملت کی تعمیر کرنے کے لئے جملہ وسائل وامکانات کے استعمال کے جائز اور قانونی حق کو تسلیم کرتی ہے۔

۲۔ بیرونی طاقت اور سامراجی نظام کے سایہ میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی ہر اس کوشش کو جائز اور قانونی تسلیم کیا گیا ہے جو ان کے حقِ خود انفصالی (Self determination) کی بحالی کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اس سلسلے میں ان قوموں کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ وہ ملک و ملت کی تعمیر کے لئے بیرونی امداد و عطیات بھی حاصل کر سکیں جن کے بارے میں مختلف مواقع پر

اقوام متحدہ کے اجلاس میں مکمل وضاحت کی جاچکی ہے۔ ہر طرح کی مادی اور معنوی امداد حاصل کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا لازمی ہے کہ اس سے اقوام متحدہ کی دوسری کسی قرارداد یا خود اس کے منشور کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

۳۔ یہ قرارداد ایسی ان تمام حکومتوں کو اقوام متحدہ کے منشور کی پیروی کی دعوت دیتی ہے۔ جو دنیا کی سامراجی اور بیرونی طاقت کے سایہ میں زندگی بسر کرنے والے عوام اور ملکوں کی امداد کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس قرارداد کے ذریعے ایسے ملکوں اور حاکموں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ مظلوم اقوام کے اس بنیادی اور انسانی حق کا اقوام متحدہ کے آئین اور بنیادی قوانین کے مطابق باقاعدہ احترام کریں۔

۴۔ یہ قرارداد ان تمام ملکوں کی بھرپور تردید کرتی ہے جو سامراجیت کی غلامی پر مجبور ہونے والی قوموں کے حق خود انفصالی کا احترام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ قرارداد خصوصیت کے ساتھ ان ملکوں کی اعلانیہ مذمت کرتی ہے جو جنوبی افریقہ اور فلسطینی مظلومین کے جائز حقوق کا احترام کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

پس ان اسناد و مدارک اور لازمی شواھد کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ اقوام متحدہ کی رکنیت والے دنیا کے تمام ممالک اقوام عالم کے اس قانونی حق کا احترام کرتے ہیں کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے پوری طرح آزاد ہیں اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی جنوبی افریقہ اور فلسطین کے عوام کی امدادی اور نجات طلب سرگرمیوں کی بھرپور حمایت کی ہے تاکہ وہ حق خود انفصالی سے مالا مال ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرنے پر قادر ہو جائیں۔

اسی طرح Geneva Convention Protocol-1949 کی دفعہ ۴ کے بموجب ۱۹۷۷ء کی مسلحانہ سرگرمیوں کے دوران قربان ہونے والے لوگوں کی حمایت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ شرائط کا اطلاق گذشتہ پیراگراف (دفعہ ۳) میں شامل ان تمام مسلحانہ جدوجہد پر ہوتا ہے جو سامراجی اور بیرونی طاقتوں کے چنگل میں گرفتار عوام اپنے حق خود انفصالی کی بحالی کے لئے ظالم اور نسل پرست حکومتوں کے خلاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ فلسطینی

عوام کی مسلحانہ سرگرمیاں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان دوستانہ روابط کی ایجاد کے ضمن میں اس بات کا خاص خیال رکھے کہ کسی بھی قوم کو اس کے بنیادی حق یعنی اپنی قسمت کے فیصلے کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔ ان میں بین الاقوامی اسناد و مدارک اور معاہدہ و قوانین کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہر حق پسند انسان کے ذہن میں درج ذیل سوالات کا پیدا ہونا لازمی معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ کیا اپنے حق خود انفصالی کی بحالی کی خاطر، جس کو دنیا کے تمام ملکوں اور بین الاقوامی اصول و قوانین کی حمایت حاصل ہے، فلسطینی عوام کی حق پسندانہ جدوجہد اور مسلحانہ سرگرمیوں کو دہشت گردی کا نام دیا جا سکتا ہے؟

۲۔ کیا قرارداد ۲۶۴۹ کی دفعہ ۲ نے دنیا کی مظلوم قوموں کا یہ حق نہیں تسلیم کیا ہے کہ مقبوضہ طاقتوں کے خلاف وہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے ہر طرح کی مادی اور معنوی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں؟

۳۔ کیا دنیا کے وہ ممالک دہشت گرد ہیں جو اقوام متحدہ کے منشور اور عالمی معاہدوں کی پیروی کرتے ہوئے فلسطین کی مادی و معنوی حمایت کر رہے ہیں تاکہ اسے اپنی قسمت کے فیصلے کا حق دوبارہ حاصل ہو جائے یا وہ ممالک دہشت گردی کی حمایت میں ہمہ تن سرگرم ہیں جو غاصب اور نسل پرست اسرائیلی حکومت کو اربوں ڈالر سالانہ کی مادی اور طرح طرح کی معنوی امداد فراہم کرتے چلے آرہے ہیں اور دن بہ دن صہیونی جلادوں کو طرح طرح کے مہلک اسلحوں سے آراستہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ غور طلب امر یہ ہے کہ دونوں میں سے کون دہشت گردی کی حمایت کر رہا ہے؟

۴۔ اپنے حق خود انفصالی کی بحالی کی خاطر ملت فلسطین کو کن وسائل و امکانات سے کام لینا چاہئے؟

۵۔ کیا فلسطینی عوام کا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور انسانی حقوق کی حفاظت کی دعویدار ان عالمی تنظیموں سے امید لگا کر بیٹھے رہنا کافی ہے جو صرف زبانی جمع خرچ یعنی اسرائیلی جلادوں کی مذمت اور ملامت کر سکتی ہیں جبکہ دنیا کی اکلوتی بڑی طاقت اور اس سے وابستہ ملکوں کی نظر میں اس قسم کی مذمت

کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟

۶۔ کیا عالمی سلامتی کاؤنسل پر بھروسہ کئے رہنا کافی ہے جو گذشتہ پچاس سال سے فلسطینی عوام پر انسانیت سوز صہیونی مظالم کا تماشہ دیکھ رہی ہے اور اس تنظیم کے بعض دائمی ممبران غاصب اسرائیل حکومت کے گہرے دوست اور ویٹو پاور کے حامل بھی ہیں؟

۷۔ کیا خوفناک F-16 نامی امریکی جنگی جہازوں اور جدید ترین ٹینکوں کے حملوں کے دوران تباہ شدہ مکانات کے ملبوں کے نیچے دبے ہوئے فلسطینی مظلوموں کے نالہ و فریاد اور ان حملوں کا مقابلہ کرنے لئے سنگ بکف کمسن بچوں کی مجاہدانہ سرگرمی پر بھروسہ کئے ہوئے بیٹھے رہنا مناسب ہے؟

۸۔ کیا فلسطین کی جوان نسل کی ناامیدی و مایوسی کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ گذشتہ پچاس سال سے اپنے جائز حقوق کی بحالی و بازیابی کے لئے ایک نابرابر جنگ میں لگے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ ایک امریکہ کے علاوہ دنیا کے تمام ملکوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ فلسطینی عوام مظلوم اور صہیونی حکمراں جلاد و ظالم ہیں۔ چنانچہ اسی سال جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس کی قرارداد کے مسودہ میں یہ بات پوری طرح تسلیم کرلی گئی کہ اسرائیلی حکومت ایک نسل پرست حکومت ہے۔ جی ہاں! اس عالمی کانفرنس میں دنیا کے صرف دو ملک یعنی اسرائیل اور امریکہ ہی اس تجویز کے مخالف تھے باقی تمام ممالک اس بات پر پوری طرح متفق تھے۔ فقط ان دو ملکوں کے نمائندوں نے کانفرنس ہال سے واک آؤٹ اختیار کیا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس تجویز کی مخالفت میں امریکہ نے اسرائیل سے پہلے کانفرنس ہال ترک کر دیا تھا۔ کیا امریکہ سلامتی کاؤنسل کے پانچ میں سے ایک اہم دائمی ممبر اور حق استرداد و امتناع (Veto Power) جیسے خصوصی اختیار سے مالا مال طاقتور ملک کی حیثیت سے، جس کو یہ بھی برداشت نہیں ہے کہ جلاد صفت اسرائیلی حکومت کو نسل پرست کہا جائے، فلسطینی نوجوان نسل کو یہ اطمینان دلا سکتا ہے کہ انہیں مہلک اور خودکش سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سلامتی کاونسل کی رکنیت والے ملکوں نے یہ ٹھوس ارادہ کرلیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور میں درج شدہ اصول مثلاً تمام ممبر ملکوں کے درمیان برابری، اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور انسانی مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں تمام ممالک

کے درمیان حقیقی تعاون، انسانی حقوق کے احترام کی ترویج و حوصلہ افزائی اور نسلی، جنسی، لسانی، مذہبی اور عدالتی امور میں اقوام عالم کے درمیان کسی قسم کے تعصب و امتیاز کے بغیر تمام کام انجام دیں گے اور دنیا کے لوگوں کو یکساں سیاسی آزادی حاصل ہوگی (اقوام متحدہ منشور دفعہ اول دوم کے کچھ حصے) اور عالمی سطح پر صلح و سلامتی کے قیام میں ذاتی پسندیدگی اور ظالمانہ راہ و روش سے کام نہ لیں گے!

در حقیقت سردست اقوام عالم اپنے حق خود انفصالی کی بحالی و بازیابی کے لئے جو آزادی طلب مسلحانہ سرگرمیاں انجام دے رہی ہیں انہیں اقوام متحدہ کے منشور کے بموجب دہشت گردی کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے لیکن جب دنیا کے مختلف علاقوں میں جاری آزادی طلب مسلحانہ سرگرمی کی بات آتی ہے تو دنیا کے تمام ممالک ایک دوسرے پر دہشت گردی کی حمایت کا الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ سردست جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام ممالک اور بین الاقوامی ادارے فلسطینی عوام کی حق پسندانہ جدوجہد کو آزادی طلب سرگرمی کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا دوسرا موضوع ہو جس کے بارے میں تمام ملکوں کا متفقہ علیہ ایک ہی خیال ہو جیسا کہ فلسطین کے سلسلے میں ہے کہ فلسطینی عوام اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پس بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مظلوم فلسطینی عوام کی آزادی طلب جدوجہد ان کا جائز اور قانونی حق ہے اور گذشتہ چند دہائیوں کے دوران غاصب صہیونی جلادوں کی مسلحانہ کارروائی در حقیقت دہشت گردانہ عمل ہے اور فلسطینی مظلومین کی سرکوبی کیلئے دنیا کے جو حکمراں متجاوز صہیونی جلادوں کو اربوں ڈالر کی فوجی امداد فراہم کر رہے ہیں اور ان کی فوج کو جدید ترین اسلحوں سے مسلح کر رہے ہیں اور مشرق وسطیٰ میں فلسطینی مظلوموں پر کی جانے والی بمباری میں کسی طرح بھی ملوث ہیں وہ عالمی برادری کے سامنے بہر حال جوابدہ ہیں اور ان لوگوں کے خلاف کسی صالح بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلانا چاہئے تاکہ ظالم اور مظلوم دونوں کی شناخت ہو سکے، ظالم کو اس کے انسانیت سوز مظالم کی سزا مل سکے، مظلوم کو عالمی حمایت سے مالا مال کیا جاسکے اور اس طرح دنیا کے تمام لوگ صلح و سلامتی اور انسان دوستی کی فضا میں چین کی سانس لے سکیں۔

☆☆☆☆☆☆

اقبال ـــــ فارسی دانشوروں کی نظر میں

ڈاکٹر محمد امین عامر

اردو شاعری میں جس طرح اقبال کی منفرد، ممتاز اور بلند و بالا حیثیت مسلم ہے اسی طرح فارسی شاعری میں بھی اقبال کی حیثیت معروف و مستند ہے۔ان کی فارسی شاعری کے قدرداں جہاں ارباب اردو ہیں وہیں فارسی دانشوروں نے بھی بجان و دل ان کی قدر کی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال حکماء و صوفیائے ایران مثلاً مولانا جلال الدین رومی اور حکیم سنائی وغیرہ کے افکار سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری فارسی شاعری میں انہی بزرگوں کے خیالات اور افکار کا عکس نمایاں طور سے غالب رہا ہے۔ اقبال جس تصوف اور فلسفۂ اسلامی کے حامی تھے ایرانی شعراء و حکماء میں وہی تصوف اور فلسفہ رائج تھا۔ اقبال کی زندگی کا جو مقصد اور نصب العین تھا اس کی گونج رومی اور سنائی کے یہاں بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایسی صورت میں یہ اقبال کی سعادتمندی اور خوش بختی تھی کہ وہ انہی بزرگوں کے نقش قدم پر چل پڑے جو انہیں منزل مقصود تک پہنچادیں اور جن کے افکار عالیہ سے خوشہ چین ہو کر اقبال اپنی فکر کو تاباں اور توانائی بخش سکے اور مستقبل میں فارسی دانشوروں، شعراء اور ادباء کی صفوں میں اپنا مقام متعین کر سکے۔

اقبال سے متعلق درج ذیل چند فارسی دانشوروں کے خیالات تحریر کئے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اقبال سرزمین علم و ادب یعنی ایران میں کہاں تک مقبول و پسندیدہ رہے۔ اقبال کی اسلامی فکر اور فارسی شاعری پر ایک ایرانی دانشور اور ادیب ڈاکٹر لطفعلی صورت گر کے خیالات ملاحظہ ہوں۔، موصوف فرماتے ہیں۔

" اگر این نگرانی نبود که در قدر شناسی از مرحوم اقبال شاعر بزرگ پاکستان دقایق معدود مجال بحث را می گیرد وحق مقام را بواقعی نمی توان اداکرد، چه مسرتی ازین بالاتر که دیوان شاعری را مطالعه کنیم وتراوش فکر او را

که به قالب الفاظ عذب وگوارا در آمده واز نوك خامه اش بر صفحه چکیده است... اقبال یکی از آن ستار گان فروزان است که روحی افروخته وملتهب وذوق لطیف وجمال پرست ودل تاثر پذیر دارد واین اوست که باقتفای از بابا طاهر میفرماید.

نهان در سینهٔ ما عالمی هست
بخاك ما دلی، در دل غمی هست
از آن صهبا که جان ما برافروخت
هنوز اندر سبوی ما نمی هست"

اقبال

یہاں تک ڈاکٹر موصوف اقبال کے بلند مقام ومرتبہ، ان کی شیریں سخنی، فکری تازگی اور فرحت قلب سے مالا مال شاعری، نیز ساری دنیا میں ان کے کلام کی شہرت کا تذکرہ کرتے ہوئے دنیا کے دیگر شعرائے بادہ فروش اور جام عشق ومحبت لٹانے والوں میں اقبال کو بحیثیت ایک درخشاں ستارہ کے پیش کرتے ہیں کہ جن کی شاعری سے روح کو تازگی ملی اور دل ونظر کو پر لطف ذوق اور جمال کا تحفہ عنایت ہوا۔ مذکورہ بالا اشعار میں اقبال نے ایران کے معروف صوفی بزرگ بابا طاہر رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی بے پناہ ارادتمندی کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ہمارے سینے میں ایک ایسی دنیا پوشیدہ ہے کہ جس کے صہبا سے ہمارے دل کی دنیا روشن اور منور ہے۔

ڈاکٹر صور تگر نے مزید خامہ فرسائی کی ہے۔

" شعراقبال گذشته از آنکه نماینده یك مغز افروخته وحساس است لطفی مخصوص دارد که بی اختیار آدمی را مجذوب می کند ومستی میآورد...از کلام این مرد بزرگ که روشن مهبط انوار فیض یزدانی بادختام این گفتار قرار میدهم یکی این دو بیتی است که میفرماید۔

قبای زندگانی چاك تا کی
چو موران آشیان درخاك تا کی

به پرواز آی وشاهینی بیاموز
تلاش دانه در خاشاک تا کی"

(اقبال)

ڈاکٹر موصوف اقبال کی شعری خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقبال کی شاعری آدمی کو مجذوب و مست بنادیتی ہے اور اس کا سب سے بڑا لطف یہ ہے کہ اقبال نے گرچہ اسی آسمان کے نیچے اور ہندوستانی آب و ہوا میں نشو نما پائی ہے مگر اس کی فکر کے سوتے اس مشرقی فلسفہ و عرفان سے ملتے ہیں جس میں مولانا جلال الدین رومی، حکیم غزنوی اور عارف نیشاپوری جیسے باکمال عارف باللہ ہستیوں کے افکار نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کیا خوب علامہ اقبال کے دو اشعار کا حوالہ دیا ہے جس میں اقبال نے انسان کو صفحۂ ہستی پر اپنا بلند و بالا مقام پیدا کرنے اور خس و خاشاک میں چیونٹیوں کی طرح ذلت آمیز زندگی سے نجات حاصل کرنے کی تحریک دلائی ہے اور اپنی پرواز فکر کا اقبال نے ایسا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کو چار و ناچار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اقبال کی شاعری "انوار فیض یزدان" کا کرشمہ ہے۔

اسی طرح ایران کے ایک مشہور دانشمند اور مصنف آقای سید حسن تقی زادہ اقبال سے متعلق رقمطراز ہیں۔

" محمد اقبال دانشمندی بلند پایه وسخنوری پر مایه است که از چشمهٔ فیاض بزرگان وعرفاء وسخن سرایان ایران سیراب شده وبرای رساندن افکار خیر خواهانه خود بمسلمانان خطه هندوایران وافغانستان وتاجکستان وقفقاز وترکیه وعراق زبان فارسی را برگزیده است."

سید حسن تقی زادہ کا قول ہے کہ اقبال ایک بلند پایہ دانشور اور عظیم شاعر ہیں ان کی شاعری ایرانی بزرگوں اور شعرائے اہل اللہ کے فیوض کی بخشش ہے جسے انہوں نے مسلمانان عالم کے سامنے پیش کیا۔ پھر وہ اقبال کے درج ذیل دو اشعار پیش کرتے ہیں جس میں اقبال نے مادی ترقیات اور مغربی تہذیب و تمدن پر کاری ضرب لگاتے ہوئے اسے سراسر دنیائے انسانیت کے لئے ضرر رساں بتایا ہے۔ اقبال کا یہ خیال ہے:

قوت مغرب نہ از چنگ ورباب
نئ زرقص دختران بی حجاب
محکمی اورا نہ از لادینی است
نئ فروغش از خط لاطینی است

اقبال

یعنی مغرب کی طاقت نہ چنگ ورباب میں ہے اور نہ بے حجابانہ لڑکیوں کے رقص وسرود میں یہاں تک کہ مغرب دین سے بیزار رہ کر نہ تو استحکام حاصل کر سکتا ہے اور نہ وہ فروغ پا سکتا ہے۔ آئے دن کے مشاہدات و تجربات اس پر شاہد ہیں۔

عبدالحسین نوری مشہور ایرانی ادباء میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے گرانقدر مقالات اور مضامین ایرانی رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی فارسی تصنیف جاوید نامہ کو بڑا پسند کیا ہے جس میں اقبال نے آخر صدی کے بلند و عمیق افکار کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور ہر قسم کے سیاسی، وطنی اور مذہبی تنازعات سے مسلمانانوں کو بالکل الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیکر انہیں اسلامی اصولوں پر کاربند ہونے کی تلقین فرمائی۔ موصوف جاوید نامہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

" درمیان کتب متعدد مرحوم اقبال شاعر بزرگ ملّئ پاکستان من جاوید نامہ را پیش از همه می پسندم... واز ین گونه شعراء درجهان بسیار شده اند ولی میتوانم به جرأت بگویم که هیچ شاعری درمنظورهای ملّی واجتماعی خویش باندازهٔ مرحوم اقبال پیش رفت نکرد...جاوید نامه روح کتب وافکار عقاید اقبال است که او کاملاً بصورت یك متفکر اجتماعی با آمال ملی ظاهر ومتجمل میشود."

اقبال کی فکر سے متعلق ایسی زبردست خراج عقیدت کا اظہار شاید ہی کسی ایرانی ادیب اور دانشور نے کیا ہو۔ عبدالحسین نوائی کا بہت ہی جرأت اور بے باکی سے یہ دعویٰ ہے کہ ملی واجتماعی مقاصد کی بر آوری کے لئے اقبال نے جو خدمات انجام دی ہیں دنیا کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ اقبال کا بہت بڑا کارنامہ تھا جسے اقبال نے اپنا دینی اور اخلاقی فریضہ سمجھ کر انجام دیا۔ یہی سبب ہے کہ ایسا

روشن ضمیر اور بلند فکر شاعر عوامی مقبولیت کا حقدار قرار دیایا۔ ان کی تصنیف جاوید نامہ کو ان کے افکار وعقائد کی روح قرار دیا جاسکتا ہے جس میں اقبال ایک مکمل اجتماعی فکر کا حامل پیکر بنکر جلوہ افروز ہے۔

موجودہ صدی کے نادموردانشمند استاد سعید نفیسی مختلف گرانقدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے علمی وادبی مقالات اور مضامین ایرانی رسائل وجرائد میں بھرے پڑے ہیں۔ اقبال جیسے عظیم شاعر کے بارے میں ان کی رائے جاننی ضروری ہے۔ ایک موقع پر اقبال کی شاعری سے متعلق اس طرح گویا تھے۔

" خاصیت بسیار مهمی که در اشعار اقبال هست که اعتماد عجیبی بآیند ه مشرق زمین دارد وباکمال صراحت معتقد هست...استقلال هند وستان وپاکستان وآنچه درشرق اقصیٰ درشرف وقوعست آیا تااندازه ای پیشگوی های اورا مسلم نمی کند؟"

اقبال کی فکری وسیاسی بصیرت کی آج بھی دنیا قایل ہے۔ انہوں نے دنیاوی حادثات اور انقلابات سے متعلق جو پیشگوئیاں اپنے اشعار میں کی ہیں۔ دنیانے دونوں آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ اسی مشاہدہ اور تجربہ کا تذکرہ سعید نفیسی کی زبان بھی کررہی ہے۔ انہوں نے اقبال کی اس شعری خصوصیت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے جس میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ مشرق پر مغرب اور مغرب پر مشرق کے تسلط وغلبہ کا ذکر ہے۔ بلاشبہ اقبال صرف ایک شاعر اور مفکر ہی نہیں بلکہ ایک مستند مبصر بھی تھے جن کے بصیرت افروز کلام سے ساری دنیا میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

اقبال اوائل جوانی ہی سے ایرانی علوم ومعارف اور فلسفے سے آشنا تھے۔ اپنے قیام یورپ کے دوران بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ سے بحث ومذاکرہ کے ذریعہ قدیم وجدید یوروپی فلسفہ سے آگاہی حاصل کی اور ایرانی فلسفہ کا جدید یوروپی فلسفۂ مبادیات سے مقابلہ کرکے نتائج اخذ کئے۔ چنانچہ قدیم ایران کے فلسفہ سے متعلق اقبال کے خیالات، تجربات اور مشاہدات کا تذکرہ تہران یونیورسٹی کے فارسی ادب کے استاد ڈاکٹر محمد معین نے اپنے گرانقدر مقالہ "اقبال وایران" میں کیا ہے جس سے ایرانی سائنس اور فلسفہ سے متعلق اقبال کی معلومات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

عہد پہلوی کے ایک ایرانی دانشمند جناب حسین علامہ 'اقبال کے افکار عالیہ اور مسلمانان عالم کو

دعوت اتحاد دینے کے ضمن میں ان کی خدمات کے اس طرح معترف ہیں:

" مرحوم اقبال فرزند نور محمد بافکر وروح بزرگ وتابناك که داشت همچونام پدرش مشعل از نور محمدی بدست گرفت وبعالم اسلام ومسلمانان قاره هند وپاکستان با اشاعه آن همه مقاصد ومعانی بلند که در اشعار خود گنجا نیده بسیار خدمت کرد ودرراه وحدت مسلمانان زحمات بیشمار کشید."

ایک مشہور عربی دانشور اور ادیب امر شکیب ارسلان نے اقبال کو عظیم ترین مفکر گردانتے ہوئے کہا ہے کہ "اقبال ازبرگترین متفکری است که جهان اسلام در طول هزار سال اخیر بوجود آورده است۔" یعنی امیر کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی دنیا کو ہزار سال کے طویل عرصے میں اقبال جیسا ایک عظیم مفکر ہاتھ آیا ہے۔

عصر جدید کے مشہور شاعر ملک الشعراء بہار نے اس طرح اقبال کی تصویر کشی کی ہے:

" من اقبال را خلاصه ونقادهٔ مجاهد ات ومساعی جاوید ان نهصد ساله۔

نمازیان وعالمان وادبای اسلامی ومیوهٔ رسیده وکمال یافتهٔ این بوستان نهصد رساله دانستم وپس از ذکر دانشوران وهنر مندان درحال سلامی دربارهٔ ممدوح خود چنین گفتم ."

بہار کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ نو سو سال کی مدت میں اسلامی ادباء علماء اور نمازیوں میں پیدا ہونے والے اقبال کی حیثیت ایک ایسے پکے ہوئے پھل کی طرح ہے کہ جس کی بابت میں خود معترف ہوں کہ

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد هزاران برگذشت

مذکورہ بالا چند ایرانی ادباء شعراء اور فارسی دانشوروں کے تاثرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل زبان نے بھی اقبال کی فارسی شاعری کا اثر بہت حد تک قبول کیا تھا اور جس کی بہ دولت اقبال کو انہوں نے اپنے دلوں میں جگہ دی اور فارسی شاعری کی حیثیت سے اس کی برتری اور عظمت کو تسلیم کیا۔

☆☆☆☆

تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک

پروفیسر سید جعفر رضا

تصوف، بحیثیت تحریک احیائے دین اسلام، اس کے مقاصد، دائرہ عمل اور اثرات کا جائزہ لینے میں مد نظر رکھنا ہوگا کہ روحانی اساس سے کوئی مذہب خالی نہیں ہے کیونکہ مذہب انسانی جبلت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور روحانیت انسانی جبلت میں داخل ہے ہر بشر کے بنیاد باطن میں ایک قوت غریزی کا وجود ہوتا ہے، جس کو اصطلاح میں 'ورائے شعور' (Supra Conscious) کہا گیا ہے۔ اگر یہ ورائے شعور بیدار ہو جائے تو فرد معنویات کی دنیا تلاش کرنے میں روحانیت کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔ یہ روحانیت ان قلوب میں بھی خوابیدہ رہتی ہے، جن کو خدا پرستی یا مذہب شناسی سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ البتہ خدا پرستوں میں روحانیت عرفان الٰہی کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں عارفوں کی جماعت نظر آتی ہے۔ بعض مذاہب میں عرفانیت کو رہبانیت سے وابستہ کر دیا گیا لیکن اسلام نے سماجی نظام زندگی کے ساتھ خدا پرستی کی تعلیم دی تو متقین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آگئی، جو فواکہات دنیا سے کنارہ کش ہو کر الفقر وفخری کو اعلیٰ اقدار حیات قرار دیتی تھی اور عبادت الٰہی کے ذریعہ روحانی مراحل طے کرتی تھی۔ اس ضمن میں ملحوظ خاطر رہے کہ صدر اسلام کے بعد (۴۱ھ/۶۶۱ء کے بعد) دنیاداری، عیش پرستی اور ایمان فروشی کی گرم بازاری ہوئی اور حاکمان بنوامیہ نے عرب جاہلی کو اسلام پر مسلط کر دیا تو اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید رد عمل رونما ہوا، جس کے نتیجے میں میدان جنگ میں صفیں آراستہ کرنے کے علاوہ روحانی تربیت کی صفیں بھی آراستہ کی گئیں۔ اسلامی اقدار کو روحانی اداروں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی بنا پر تصوف کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب نام نہاد خلفائے بنوامیہ کی دنیاداری، عیش پرستی اور ایمان فروشی کو قرار دیا

گیا ہے۔[۱]

اسلام میں غیر اسلامی عناصر کے فروغ پانے میں ملکی فتوحات کی توسیع پسندی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس توسیع پسندی نے ممالک اسلامیہ کے جغرافیائی حدود میں کئی مقتدر ممالک کی سرحدوں کا احاطہ کرلیا۔ اس سے متعدد نئے ابعاد ابھر کر سامنے آئے۔ شہریت کو صحرائیت پر فضیلت حاصل ہوئی تو مسلمانوں میں صحرائی زندگی کی سادگی ختم ہوگئی۔ مفتوح قوموں نے احساسِ شکست کے ساتھ اسلام قبول کرلیا لیکن یہ لوگ اپنے دل ودماغ کے دامن میں خاموشی سے اپنے تہذیبی و مذہبی ورثے کو چھپائے رہے اور خاص خاص مواقع پر اسلام سے اپنے قدیم مذہب کی برتری کی جانب اشارہ کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ علاوہ بریں علمی وفکری سطح پر مسلمانوں کا یونانی، ایرانی اور ہندوستانی علماء وحکماء سے رابطہ ہوا تو ان ممالک کے مذاہب مثلاً یہودیت وعیسائیت، ویدانت وبدھیت اور زردشتیت و مانیت کے مسائل ومباحث سے مبادلہ ومجادلہ شروع ہوا۔ اہل عرب یہود ونصاریٰ سے واقف تھے، ان کے اعتراضات سے کان آشنا تھے لیکن پہلے وہ دائرہ اسلام کے باہر رہ کر بحث وتکرار کرتے تھے، اب اہل اسلام بن گئے تھے اور تسکین بالقلب کے لیے اپنے پرانے مذہب کا اپنے نئے مذہب سے تقابلی مطالعہ کر کے سمجھنا چاہتے تھے کہ اس نئے مذہب کو اختیار کرنے کی بنا پر ان سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوگئی ہے۔ ان کے پیش نظر فقہی مسائل کے علاوہ روحانی مسائل بھی تھے جن پر دورِ قدیم سے عملی تجربہ کرتے آئے تھے۔ فقہی مسائل حل کرنے کے لیے فقہاو متکلمین کی جماعت موجود تھی، جو دقیق نظری سے شریعت کے مختلف پہلوؤں کا دفاع کرتی تھی اور مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنتی تھی لیکن ان مشکلین اور ارتیابین کے روحانی مسائل کو حل کرنے کے خاطر خواہ جواب ان کے پاس نہیں تھے۔ یہ کارنامہ صوفیہ کی جماعت نے سرانجام کیا، جنھوں نے انھیں کے معیار ومیزان پر مسائل ومباحث کو برتا، جن پر مشکلین اور ارتیابین برتنا چاہتے تھے۔ ان کی عدیم المثال کامیابیاں عیاں راچہ بیاں ہیں۔

متذکرہ بالا تناظر میں اہل کلام، معتزلہ، مشکلین، احیائے سنہ اور اشاعرہ کی تحریکات بھی شامل کی جاسکتی ہیں۔ اہل کلام کی تحریک کو مختلف علوم کی کتابوں کے عربی ترجموں کی پیدا کردہ صورت حال نے جنم دیا تھا۔ خلافت بنو عباس میں 'دار الحکمت' کے نام سے ترجمہ وتالیف کا ادارہ قائم

ہوا جو تقریباً دو سو برس تک سرگرم عمل رہا۔ اس کے زیر اہتمام متعدد کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں کیے گئے۔ مثلاً ابو بشر متی (م۔ ۳۲۸ھ/ ۹۴۰ء) نے ارسطو کی 'بوطیقا' کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ارسطو کی دوسری کتاب 'ریطوریقا' کا ترجمہ بھی عربی میں ہوا۔ حنین ابن اسحاق نے افلاطون اور جالینوس کی کتابوں کے ترجمے براہ راست یونانی سے عربی میں کیے۔ فلاطینوس کے مضامین 'دینات ارسطو' کے نام سے ترجمہ کیے گئے۔ الکندی (م۔ ۲۵۲ھ/ ۸۶۶ء) نے ارسطو اور افلاطون کے دبستانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ الخوارزمی (م۔ ۲۲۰ھ/ ۸۳۵ء) نے ہندی اعداد و شمار، فلکیات اور نجوم سے اہل عرب کو روشناس کر دیا۔ ان نئی معلومات نے اسلامی علماء و فقہاء کے تقلیدی ذہنوں میں تلاطم برپا کر دیا۔ ان تراجم کی بنا پر اسلامی اعتقادات کا از سر نو جائزہ لینے کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ تحریک معتزلہ، جس کو اسلامی تاریخ میں اعتزال کا نام دیا گیا، تحریک مجادلہ افکار و آرا تھی۔ اس تحریک کے اصل محرک واصل بن عطاء (م۔ ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء) اور عمر بن عبید (م۔ ۱۴۶ھ/ ۸۶۳ء) تھے۔ ان کو سیاسی اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب انھوں نے اموی خلیفہ ولید بن یزید (۱۲۵ھ/ ۷۴۳ء) کے خلاف بغاوت میں سرگرمی دکھائی اور اس کی جگہ یزید بن ولید (م۔ ۱۲۶ھ/ ۷۴۴ء) کو برسر اقتدار لائے، جو مسلکِ اعتزال پر تھا۔ معتزلہ قانون اسلام کے مآخذ میں اجماع کو ساقط قرار دیتے تھے۔ ہر مسئلہ کو عقل کی میزان پر تولتے تھے۔ وہ دقیق جدلیاتی فکر کے ذریعہ خدا کے تصور وحدت تک پہنچتے تھے۔ ان کی جدلیاتی فکر وہ اساسی نقطہ ہے، جس میں عام راسخ العقیدہ مسلمان اور معتزلہ کے درمیان اختلاف پیدا ہونا فطری امر تھا۔ حالانکہ تحریک معتزلہ میں مختلف قومیات کے افراد شامل تھے لیکن اصلاً یہ ایرانی تحریک تھی۔[۲] جس میں شیعی و قدری عقاید دوش بدوش پائے جاتے تھے۔ بعض معتزلہ کھلے ہوئے شیعی تھے۔ ان میں ابوالہذیل کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے[۳] معتزلہ صفات الٰہی کے علاحدہ وجود سے انکار کرتے تھے، ان کا تصور تھا کہ یہ صفات مجردہ ہستی ربانی کی بالکل عین ہیں۔ ابوالہذیل کہتا ہے کہ خدا ہمہ دان، قادر و مطلق اور ذی حیات ہے اور علم، قوت اور حیات پر اس کی ذات مشتمل ہے۔[۴] اس دور میں ایک اور فکری میلان ابھرا جس کو تحریکِ ارتیابیت کہتے ہیں۔ اس کی فکری اساس بھی جدلیاتی طریقہ کار پر مبنی تھی۔ اس کے خاص نمائندوں میں ابن اشرس اور الجاحظ (م۔ ۲۵۶ھ/ ۸۶۹ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ

ارتیابین یا مشککین فطرت پسندی (Naturism) کی جانب مائل تھے۔۵ اس دور کی ایک اور اہم تحریک احیائے سند ہے جو خالص ایرانی تحریک تھی جس نے ذہنی آزادی کو عام کیا۔ اسی زمانہ میں آزاد خیالی کے زبردست دشمن ابوالحسن الاشعری (م۔۳۳۱ھ/۹۴۱ء) نے تحریک اشاعرہ کو جنم دیا۔ اشعری کے اکثر پیرو بھی ایرانی تھے۔ اس لیے اشاعرہ کو خالص سامی تحریک قرار دینا درست نہیں ہے۔۶ انھوں نے مقاومت کترین کا رویہ اختیار کیا۔ فلسفیانہ مباحث کی قرآن وحدیث کی روشنی میں تاویلات کرتے رہے۔ عام راسخ العقیدہ مسلمان کو ان کا رویہ خاطر خواہ نظر آیا، جس سے ان کو مقبولیت حاصل ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک تحریک اشاعرہ برگ وبار لاتی رہی لیکن چونکہ اساسی طور پر اس تحریک کا زاویۂ نگاہ مراجعت پسندانہ تھا، اس لیے نظریہ قدر واختیار میں الجھ کر رہ گئی اور قانون علت ومعلول کے نفی پر اصرار کرتی رہی، تا آنکہ امام غزالی (م۔۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) نے اشاعرہ تحریک کے تار وپود بکھیر دیے۔

یہی وہ پس منظر ہے، جو تصوف بحیثیت تحریک احیائے دین اسلامی کا پیش منظر بنتا ہے۔ ہمارے مستشرقین کرام جو تصوف کی کتابوں کے قابل تعریف مترجم ومرتب ہونے کے باوصف اکثر وبیشتر اسی پس منظر کو نظر انداز کر دینے کی بنا پر اساس تصوف کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے۔ مزید برآں گذشتہ چار صدیوں میں جس طرح مسلسل ومتواتر تعصب یکجا ہوتا رہا ہے۔ اس کی کارفرمائی بھی ہے۔ یہ میلان پہلے پہل انسان دوستی (Humanism) کی جانب تھا پھر نظریہ ارتقا (Evolution) کی صورت میں بد سے بدتر ہو گیا۔ ہمارے مستشرقین عظام مذہب اسلام، تصوف اور فلسفیانہ نظام کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔ عام طور پر تمام ایشائی اور اسلامی قوموں کے تصوف کی تعلیمات کو یکساں سمجھتے ہیں۔ ان کی کوشش رہتی ہے کہ تصوف کو اسلامی تحریک کو رومی اثرات کا حامل بنا دیں۔ ان کے اس شعوری عمل میں انگریزی اصطلاح سرّیت یا باطنیت (Mysticism) بھی تصوف کے معنی ومفاہیم کو محدود کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ علامہ اقبال (م۔۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) نے اپنے صحیح نظریہ تعلیل کی روشنی میں اسلامی زندگی کے ان خاص سیاسی، سماجی اور فکری حالات کی نشان دہی کی ہے جو چودھویں صدی عیسوی کے اواخر اور پندرہویں صدی عیسوی کے نصف میں نمایاں ہوئے، جو بعد کے ادوار میں تصوف کے فلسفیانہ جواز کی اساس بن گئے ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے:۷

اولاً، یہ کہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی بے چینی وانتشار کے نتیجہ میں زبردست خوں ریزیوں کے بعد (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) میں سلطنت بنو امیہ کا تختہ پلٹ چکا تھا، اس کے بعد مسلسل ایسے واقعات رونما ہوتے رہے کہ مفاد پرست عناصر نے عوام کی زود اعتقادی کا فائدہ اُٹھا کر اپنے سیاسی منصوبوں کو مذہبی تصورات میں پیش کیا مثلاً سند یہ (۳۹-۱۳۸ھ/۵۶-۷۵۵ء) استہ دس (۵۱-۱۴۹ھ/۶۸-۷۶۶ء) نخشب کا نقاب پوش پیغمبر ابن مقنع (۶۲-۱۶۱ھ/۷۸-۷۷۷ء) اس کے علاوہ ہارون الرشید کے بیٹوں امین ومامون میں سیاسی اقتدار کے لیے زبردست جنگ (۱۹۳-۲۰۱ھ/۸۰۸-۸۱۶ء) پھر عرب قومیت کے خلاف تحریک شعوبیت وغیرہ۔ ان حالات نے مسلسل بے چینی کے منظر نامہ سے ہٹا کر ایک حلقہ کو مراقبہ کی زندگی کی طرف مائل کر دیا۔

ثانیاً، یہ کہ اسلامی عقلیت کے ارتیابی میلانات، جو ابتداء میں ایک نابینا ایرانی مشکک شاعر بشار بن برد کی نظموں کی شکل میں رونما ہوئے۔

ثالثاً، یہ کہ جمہور اسلام کے فقہی فرقوں (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کا خشک تقدس، جو آزاد خیالی کے سخت دشمن تھے۔ خاص طور پر مسلک تشبیہ کے پیرو حنبلی، جو عباسی خلیفہ المامون (م۔ ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کے بعد عوام پر حکمراں رہے۔

رابعاً، یہ کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں کے درمیان مذہبی مناظرے جو المامون کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔ خصوصاً تلخ دینیاتی مناقشہ، جو اشاعرہ اور علم برداران عقلیت کے درمیان ہوا، جس سے مذہب فرقے میں محصور ہو گیا۔

خامساً، یہ کہ بنو عباس کے ابتدائی دور (۱۳۲-۱۹۴ھ/۷۵۰-۸۰۹ء) میں دولت کی فراوانی میں اخلاقی احساس پسپا ہوتا گیا۔

سادساً، یہ کہ عیسائی راہبوں کی زندگی اور ان کے مذہبی تصورات نے اسلامی اذہان کو متاثر کیا۔ دنیا سے بے تعلقی میں دلکشی کا احساس بڑھتا گیا۔

تصوف کیا ہے؟

تصوف کو برصغیر میں احیائے دین کی سب سے بڑی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ اس کے اثرات

دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان داعیان اسلام اور مشائخ عظام کے مزارات پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں اور مرجع خاص وعام ہیں۔ ان سے ہر شخص بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل اور صنف وسال اکتساب فیض کرتا ہے۔ ان سے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں تصوف کے خدوخال تلاش کرنا دشوار ہے۔ اولیائے کرام کی مساعی جمیلہ کو کشف وکرامت کی داستانوں میں اس طرح گم کر دیا گیا کہ خوارق عادات محیر العقول واقعات اور پراسرار عجائبات کے علاوہ کچھ اور تلاش کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے۔ صوفیائے کرام، جن کے اخلاق وکردار نے لوگوں کے دل جیت لیے، قلوب انسانی میں اسلام کی شمع روشن کر دی اور ان جنگلوں کو کشت زار بنادیا، جن میں خاک اڑا کرتی تھی، کشف وکرامات کے بیان میں بنی نوع انسان سے مختلف ہستی نظر آنے لگے۔ ان کا فقط یہ کام رہ گیا کہ قانون فطرت کے پرخچے اڑاتے رہیں اور موالید ثلاثہ وعناصر اربعہ پر اپنی خود مختار حکومت ثابت کرتے رہیں۔ نتیجے میں تصوف کا تصور مزارات شریفہ کی زیارت، قل، عرس، صندل، نذر ونیاز، چڑھاوے اور قوالی میں اسیر ہو کر رہ گیا۔ اس لیے لازمی ہو گیا ہے کہ تصوف کا اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے۔

تصوف کے معانی ومفاہیم کے تعین میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں جن میں یہ نظریہ زیادہ مروج ہے کہ تصوف مادہ 'ص وف' باب تفعل سے مشتق ہے، جس کے معانی ہوں گے، خود کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا۔ بہ صورت دیگر اس کے معانی براہ راست مادۂ اشتقاق یعنی 'ص وف' سے وضع کیے جائیں تو 'صوف' یعنی اون یا اونی کپڑا ہوں گے۔ متعدد احادیث میں مذکور ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونی کپڑے زیب تن کرتے تھے۔[8] لیکن عین ممکن ہے کہ یہ اصطلاح 'صوف' کے بجائے صوفی کی ماضی مجہول سے 'وضع' کی گئی ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اصطلاح دونوں الفاظ سے الگ الگ وضع کی گئی ہو۔[9] ان کے علاوہ متعدد اشتقاقات پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

صف: اہل صفہ جو عہد رسالتمآب میں مسجد نبوی کے پیش دالان (صفہ) میں رہتے تھے۔

صف: قرآن حکیم سے استدلال: والصٰفٰت صفا (باقاعدہ پر صفیں باندھنے والوں کی قسم)[10]

صوفة: عرب کا بدوی قبیلہ بنو صوفہ۔

صعوفانة: ایک قسم کی ترکاری (جو زاہدوں میں مقبول تھی۔)

صفوة القضا: گدی پر بالوں کا گچھا (رسول اسلام زلفیں رکھتے تھے۔)

یونانی سوفوس یا تھیوسوفیا (Theosophia)[11]

ان گوناگوں معانی و مفاہیم میں صوفی بزرگ ابو القاسم قشیری (م۔۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) کا استدلال اہم ہے، جو انھوں نے صوفیہ کی پشم پوشی کے متعلق پیش کیا ہے کہ یہ اس لفظ کا صرف ایک پہلو ہے۔[12] حقیقت یہ ہے کہ 'ص دف' کا مادّہ صوتی دلیلوں سے مالا مال ہے اور علم حروف، جس کے صوفیہ ماہر تھے، حروف صامتہ کی عددی قدر سے سرّی مشابہت و مماثلت کے حامل ہیں مثلاً 'صفا' (پاکیزگی) 'صفو' (برگزیدہ بزرگ) 'صفی' (خاص دوست 'مصطفیٰ') وغیرہ۔

تصوف کی حقیقت قرآن حکیم میں تلاش کرنا زیادہ مفید ہے، جس کی یہ آیت تصوف کا رہنما اصول ہے۔: ربنا وابعث فيهم رسولا منهم يتلوا عليهم أيتك ويعلمهم الكتب والحكمة ويزكيهم (پروردگار، ان کے درمیان ایک رسول کو مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے۔ انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے)[13] اس آیت کریمہ سے بشر کے نہاد باطن میں خوابیدہ قوت غریزی کو بیدار کرنے کی تین منزلیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔ پہلی منزل: آیات قرآن کی تلاوت۔ دوسری منزل کتاب و حکمت کی تعلیم اور تیسری منزل: نفوس کا پاکیزہ بنانا۔ انھیں تینوں منزلوں سے گزرنے پر تصوف کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن ان منازل سے گذرنے کے لیے ایک ہادی و رہنما کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ رسول بنا کر مبعوث کرتا ہے۔ اس طرح اولیں صوفی رسول اللہ ہوئے۔ پھر ارشاد ہوا۔ قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله (اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔)[14]

اس طرح تصوف کا کلیدی محور پیروی رسول اور محبت خدا قرار پاتے ہیں۔ پیروی رسول محبت خدا کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی اور محبت خدا پیروی رسول کے بغیر ممکن نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ نیک خلق کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے صوفی کا عقیدہ ہے۔: التصوف حسن الخلق (تصوف نیک خلق کا نام ہے)[15] اس کی تین قسمیں بیان کی گئیں اولاً، اللہ تعالیٰ کے

ساتھ خلق یعنی اس کے احکامات کی تعمیل واطاعت میں سرِ مو فرق نہ آنے پائے۔ دوئم، مخلوقات خدا کے ساتھ خلق یعنی خاندان سماج، ملک و قوم کے حقوق کی ادائیگی میں تغافل نہ ہونے پائے۔ سوئم، اپنی ذات سے خلق یعنی بشر شیطانی اور نفسانی خواہشات سے محفوظ رہے۔

خواجہ جنید بغدادی (م۔۲۹۸ھ/۹۱۰ء) نے تصوف کی آٹھ خصوصیات بیان کی ہیں—— سخاوت، رضا، صبر، اشارت، غربت، صوف، سیاحت اور فقر۔ ان کی وضاحت بھی کردی ہے۔ سخاوت کا نمونہ حضرت ابراہیم ہیں کہ انھوں نے اپنی جان سے لے کر فرزند تک کو راہ خدا میں قربان کردیا۔ رضا کا نمونہ حضرت اسمٰعیل ہیں، جنھوں نے رضائے الٰہی کی تکمیل میں ذبح ہونا پسند کیا۔ صبر کا نمونہ حضرت ایوب ہیں، جنھوں نے اپنے گھربار اور وسیع کنبہ کی بربادی وتباہی اور اپنے جسم میں کیڑے پڑنے پر بھی صبر کیا۔ اشارت کا نمونہ حضرت ذکریا ہیں جنھوں نے حکم الٰہی کی تعمیل میں کئی روز تک کلام ترک رکھا اور اشاروں میں باتیں کرتے رہے۔ غربت کا نمونہ حضرت یحییٰ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اپنے وطن میں ہی غریب الوطن بن کر رہے۔ صوف کو حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کا شعار بنایا اور ہمیشہ اونی کپڑے پہنتے رہے۔ سیاحت حضرت عیسیٰ سے عبارت ہے کہ راہ خدا میں ایک پیالہ اور ایک کنگھی لے کر گھر سے چلے تھے لیکن ایک شخص کو چلو سے پانی پیتے دیکھا تو پیالہ پھینک دیا اور ایک شخص کو اپنی انگلیوں کو بالوں میں پھیرتے دیکھا تو کنگھی پھینک دی اور فقر کا نمونہ رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام خزانوں کا مالک بنایا لیکن انھوں نے فقر پر فخر کیا اور بارگاہ الٰہی میں دعاگو ہوئے——پالنے والے مجھے فقر کی حالت میں زندہ رکھ، فقر کی حالت میں موت دے اور فقراء کے زمرے میں میرا حشر فرما۔[۱۶]

صوفیہ اہل تقویٰ رہے ہیں۔ قرآنی سورتوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی منتخب و برگزیدہ افراد کی ایک جماعت موجود میں تھی، جس کے پاک نفس افراد نے اپنی زندگیاں اللہ کی راہ میں وقف کردی تھیں۔ ان کے روحانی رجحانات پر آیات کریمہ دلیل ہیں: اولئك علی هدی من ربهم و اولئك هم المفلحون (یہی وہ لوگ ہیں، جو اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت کے حامل ہیں اور فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔)[۱۷] اذقال له ربه اسلم قال اسلمت

لرب الغلمین (جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ اپنے آپ کو میرے حوالہ کردو تو انھوں نے کہا کہ میں رب العلمین کے لیے سراپا تسلیم ہوں)۱۸؎ الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالا سحار (یہ سب صبر کرنے والے سچ بولنے والے، اطاعت کرنے والے راہ خدا میں خرچ کرنے والے اور ہنگام سحر استغفار کرنے والے ہیں۔)۱۹؎ وسوف یوت الله المومنین اجراً عظیما(اور عنقریب اللہ ان صاحبان ایمان کو اجر عظیم عطا کرے گا۔۲۰؎التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والنا ھون عن المنکر والحافظون لحدود الله وبشر اللمومنین (یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد پروردگار کرنے والے، راہ خدا میں سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکیوں کا حکم دینے والے، برائیوں سے روکنے والے اور حدود الٰہیہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اے پیغمبر! آپ انھیں جنت کی بشارت دیدیں۔)۲۱؎

مذکورہ بالا آیات کریمہ اور ان کی طرح مزید آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دور صدر اسلام (۴۱ھ/۶۱۔۶۲۰ء) تک تصوف، یعنی تقرب الٰہی کی خواہش پوری امت مسلمہ میں نفوذ کر چکی تھی اور متقین کی ایک جماعت وجود میں آچکی تھی۔ حالانکہ ابھی اس جماعت کا نام نہیں پڑا تھا۔ حضرت شیخ علی ہجویری کے بقول: اس دور میں تصوف کا نام تو بے شک نہیں تھا مگر بطور ایک حقیقت کے وہ موجود تھا۔۲۲؎

متقین کی اس جماعت کے متعلق مولانا ابو بکر سراج الدین رقم طراز ہیں: "اس قسم کے اہم ترین صوفی حلقوں میں جس کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے، وہ حلقہ تھا، جو حضرت علی کرم اللہ وجہ کے گرد جمع تھا۔ حضرت علی کے انتقال فرمانے کے بعد بھی مورخین نے جس چیز کو شیعیت قرار دیا، وہ ابتدائی) تصوف کے سوا کوئی اور شے نہ تھی۔" اگر یہ مسلم ہے کہ حضرت حسن (م۔۴۹ھ) اور حضرت حسین (م۔۶۱ھ) کو صوفیہ نے ہمیشہ صدر اسلام کے اکابر اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے — سیدا شباب اھل الجنه کے علاوہ بزرگان ذیل کا ذکر بھی کرنا چاہئے: زبیر بن المخزومی المکی (م۔۱۰۴ھ) جو عبداللہ ابن عباس (م۔۶۸) کے شاگرد ہیں اور جنھوں نے اپنے استاد کی تفسیر قرآن کی تدوین کی، عبداللہ بن

خثیم کوفی (م۔۶۷ھ) اور سب سے بڑھ کر حسن بصری (م۔۱۱۰ھ) اور ان کے مریدین: مالک بن دینار (م۔۱۲۸ھ) ثابت البنانی (م۔۱۲۷ھ) اور حبیب العجمی (م۔۱۵۶ھ) جن میں سے ہر ایک کے متبعین کا اپنا اپنا حلقہ تھا۔ رابعہ عدویہ، غالباً ابن دینار کے حلقے میں شامل تھیں۔ ۲۳ سب سے پہلے اس (تصوف) کا اطلاق ابو ہاشم بن شریک (حدود ۱۳۰ھ) اور جابر بن حیان ماہر کیمیا (حدود ۱۶۰ھ) پر کیا گیا) جو دونوں کوفی تھے۔" ۲۴ لیکن اب صورت حال تبدیل ہو گئی ہے اور تصوف کو اہل تشیع کی بجائے اہل تسنن کی ایک شاخ کی حیثیت حاصل ہے۔ بایں ہمہ صوفیوں اور شیعوں میں محبت و مودت رسول و آل رسول قدر مشترک موجود ہے، جو دونوں کو رشتہ بہم مشربی میں منسلک کیے ہوئے ہے۔ اہل تشیع میں صوفیہ کے فقط تین سلاسل باقی رہ گئے ہیں ـــ نعمت اللہ (موسس: خواجہ سید نورالدین نعمت اللہ حسینی، م۔۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء) ہمدانی (موسس: خواجہ سید علی ہمدانی، م۔۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء) بکتاوشی (موسس: خواجہ شیخ حاجی بکتاوش ولی) یہ تینوں سلاسل اہل تشیع کے علاوہ اہل تسنن میں بھی مروج ہیں۔ ۲۵ بہ الفاظ دیگر یہی تینوں سلاسل ان دونوں عظیم فرقوں کے صوفیہ کے درمیان ذریعہ اتصال ہو سکتے ہیں!

محبت و مودت رسول و آل رسول کو دائمی قدر مشترک کی حیثیت سے قبول کرنے کے باوصف اہل تشیع کا صوفیہ سے کنارہ کش ہونا تاریخی المیہ ہے، جس کے محرکات میں اختلاف عقاید کے علاوہ سیاسی عوامل کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اہل تشیع انقلاب اسلامی کے فیوض و برکات کو امام وقت کی رہبری و سرپرستی میں مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک نظام اسلامی کا مرکز و منبع امام وقت ہے۔ ۲۶ جبکہ صوفیہ نے امام وقت کی بزرگی و رہنمائی قبول کرتے ہوئے، ایک مختلف روحانی ادارہ قائم کر لیا، جس کے مراکز نقباء، ابدال، اُمنۂ عمون اور قطب یا غوث ہیں۔ قطب یا غوث کا مرتبہ امام تو کیا کسی حد تک رسول سے بھی افضل ہے۔ اس جس کے گرد سارا نظام کائنات گردش کرتا ہے۔ اس کی بدولت تمام آفات ارضی و سماوی ٹلتی رہتی ہے۔ صوفیہ کا مشہور و معروف قول ہے: لادین لمن لاشیخ لہ" (جس کا پیر نہیں اس کا دین محفوظ نہیں) قطب کی بدولت دنیا قائم ہے۔ مشائخ کرام میں اس طرح دینی رہبری کا منصب امام کی بجائے قطب یا غوث کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اہل تشیع کے تمام

مذہبی عقاید کی اساس رسول و آل رسول کی پیروی پر قائم ہے۔ جب صوفیہ نے اپنا مرکز و منبع قطب کی صورت میں الگ کر لیا تو اہل تشیع کا ان سے جدا ہونا لازمی تھا۔ اہل تشیع ائمہ اہل بیت کی رہبری و سرپرستی میں اسلامی انقلاب کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے اور کرنا چاہتے تھے۔ خلفائے بنو امیہ و بنو عباس کو غاصب حقوق ائمہ اہل بیت، حاکمان جور اور ان کی حکومت کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے۔ استحقاق خلافت ائمہ اہل بیت کے خلاف ان نام نہاد خلفاء نے استحصال اور جبر و تشدد مسلط کر رکھا تھا۔ ائمہ اہل بیت کی زندگیاں قید و بند میں گذر رہی تھیں۔ باری باری شہید کیے جا رہے تھے۔ اہل تشیع بھی ائمہ اہل بیت کی پیروی میں قید و بند سے تختہ دار تک پہنچ رہے تھے۔ قتل کیے جا رہے تھے، زندہ دفن کیے جا رہے تھے اور ان کے لاشوں کی بے حرمتی کی جا رہی تھی۔ ۲۸ صوفیہ کے اپنا مرکز الگ بنا لینے کی بنا پر محبان اہل بیت دو خیموں میں تقسیم ہو گئے۔ جماعت صوفیہ نے صوف خانقاہ اور رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ اہل تشیع کے تصوف میں صوف خانقاہ اور رہبانیت کی کوئی جگہ نہ تھی۔ جماعت صوفیہ نے بنو امیہ و بنو عباس کی حکومتوں کو اسلامی مملکت نہیں قرار دیا لیکن ان کو حاکمان جور قرار دے کر ان کے خلاف جدوجہد بھی نہیں کی۔ بلکہ چند استثناؤں سے قطع نظر انھیں حاکمان جور سے عطیے قبول کرتے رہے۔ موقع بہ موقع دعائے خیر مرحمت کرتے رہے۔ اس طرح تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی سے اہل تشیع میں یہ خیال عام ہو گیا کہ تحریک تصوف کے ذریعہ امر باالمعروف ونھی عن المنکر کی تبلیغ ممکن نہیں ہو سکتی بلکہ حصول دین کے لیے عام مسلمان جو رفتہ رفتہ ائمہ اہل بیت کے گرد و پیش جمع ہو رہے تھے، ان کی اکثریت میں جوش و خروش باقی نہ رہا۔ نتیجہ میں دینی و دنیوی سرپرستی کو دوبارہ ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی کوششوں کو شدید صدمہ پہنچا۔

تحریک تصوف کے متعلق اہل تسنن بھی متفق الرائے نہیں ہیں۔ اہل تسنن میں امر بالمعروف ونھی عن المنکر کو اسلامی انقلاب کی اساس قرار دینے والے علمائے عظام کی اکثریت تحریک تصوف کے شدید خلاف ہیں۔ اہل تصوف بھی انھیں 'علمائے ظاہر' کہہ کر روح اسلام سے بیگانہ قرار دیتے ہیں۔ اہل تسنن کی کئی جماعتیں اہل تشیع کی طرح صوف، خانقاہ اور رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے کی شدید مخالف رہی ہیں۔ قدامت پسند 'حشویہ' تصوف کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ امام احمد بن

حنبل (م۔۷۹۱ھ/۷۹۵ء) تصوف کے بعض عقاید مثلاً مراقبہ اور اس کے منازل کے شدید خلاف تھے۔ان کے ارشد تلامذہ میں بشیش نسائی (م۔۲۵۲ھ/۷۶۷ء)اور ابوزرعہ نے تصوف کو زنادقہ کے کفروالحاد کی ایک شاخ میں شامل کیا ہے۔علمائے اہل تسنن کا وہ حلقہ بھی جو معتزلہ کے زیر اثر تھا، تصوف کے سخت خلاف تھا۔ عشق کے ذریعہ خالق و مخلوق کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کو لایعنی قرار دیتا تھا اور اسے عملی طور پر ملامتیہ اور حلول کے مترادف مانتا تھا۔ بعض دیگر اہم علمائے اہل تسنن بھی تصوف کے دشمن رہے ہیں۔ان میں ابن الجوزی، ابن تیمیہ اور ابن رقیم اہم ہیں۔ شیخ احمد سرہندی (م۔۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء)اور ان کے متبعین نے وحدت الوجود پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔وہابی بھی تصوف کے سخت دشمن ہیں۔حالانکہ وہابیت کے بانی عبدالوہاب نجدی نے شیخ ابو علی شقیق (م۔۱۹۴ھ/۸۰۹ء) کی مشہور کتاب وصیة بنام حاتم الاصم کی شرح لکھی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ تمام جید علمائے اہل تسنن تصوف کے مخالف رہے ہیں۔ان کی ایک جماعت 'معتدل تصوف' کو اسلام سے خارج نہیں کرتی بلکہ عملی اخلاق و عبادات کے معاملات میں ابن ابی الدنیا (م۔۲۸۱ھ/ ۸۹۴ء) کے رسائل، ابوطالب مکی (م۔۳۸۶ھ/۹۹۶ء) کی قوت القلوب اور امام غزالی کی احیاء علوم الدین سے اکتساب فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں فرقوں کے علمائے عظام کی شدید مخالفت و مخاصمت اور ان کے مفتیان کرام کے فتاویٰ کفروالحاد کے باوجود تصوف کی روحانی تحریک روزافزوں مقبول رہی ہے۔ خاص طور پر علمائے اہل تسنن کی معتدبہ جماعت تصوف کے دفاع میں سرگرم رہی ہے۔

صدر اسلام کے صوفیہ میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ اور مولائے متقیان حضرت علی سے براہ راست اکتساب فیض کرنے کے شرف کی بنا پر سلمان فارسی (م۔۳۴ھ/۶۵۵ء) ابوذر غفاری اور حذیفہ (م۔ ۳۴ھ/۶۵۵ء) کو امتیاز حاصل ہے۔ اویس قرنی (م۔ ۳۷ھ/۶۵۵ء) صہیب (م۔ ۳۲ھ/ ۶۵۲ء) سے صوفیہ کے سلسلے میں ہیں،[۹] لیکن بعضوں کے نزدیک ان کا صوفی ہونا حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ ائمہ اہلبیت میں امام حسن، امام حسین، امام زین العابدین، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کو تمام صوفیہ اپنا پیشوا مانتے ہیں[۱۰] معروف کرخی (م۔۵۲۰ھ/۸۱۵ء) کے سلسلے میں

صوفیہ امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا اور امام محمد تقی کو بھی اپنا رہنما مانتے ہیں بعض صوفیہ امام علی نقی، امام حسن عسکری اور امام مہدی آخرالزماں کے بھی قائل ہیں ان کے بعد نُسّاک (عبادت میں مصروف رہنے والے) زُھّاد (زہد و تقویٰ میں زندگی میں بسر کرنے والے) بُکّون (رونے والے تائبین) اور قُصّاص (عوام میں وعظ کرنے والے) کی جماعتیں سامنے آتی ہیں۔ ابتدا یہ گروہ الگ الگ سرگرم عمل رہے لیکن بعد میں دو فکری دبستانوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک نے اپنا مرکز بصرہ کو بنایا اور دوسرے نے اپنا مرکز کوفہ قرار دیا۔ اہل بصرہ تمیمی الاصل تھے۔ ان میں چند معتزلی اور قدری رجحانات کے حامل تھے۔ ان کے شیوخ میں ہیں: خواجہ حسن بصری (م۔۱۱۰ھ/۷۲۸ء) مالک بن دینار (م۔۱۲۸ھ/۷۴۴ء)، فضل رقاشی، رباح بن عمرو قیسی، صالح مری اور عبدالواحد بن زید (م۔۱۷۷ھ/۷۹۳ء)، جن کو عباد ان کے طائفہ زہاد کا سرسلسلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اہل کوفہ یمنی الاصل تھے، جو علم کلام میں شیعی عقاید کی طرف مائل تھے۔ ان کے شیوخ میں ہیں: ربیع بن خثیم (م۔۶۷ھ/۶۸۶ء)، ابواسرائیل ملائی (م۔۹۹ھ/۱۴۰ھ/۷۵۷ء) جابر بن حیان (م۔۸۱۷ء) کلیب صیداوی، منصور بن عمار، ابوالعتاہیہ اور عبدک صوفی (م۔۲۱۰ھ/۸۲۵ء) ان میں آخرالذکر تین شیوخ منصور، ابوالعتاہیہ اور عبدک نے اپنی زندگی کے آخری ایام بغداد میں گزارے، جو بعض وجوہ سے ۲۵۰ھ/۸۶۴ء کے بعد تصوف کا مرکز بن گیا تھا۔ یہی سال ہے، جب مذہبی مناظروں کے مراکز قائم ہوئے اور مساجد میں تصوف کا درس شروع ہوا۔ اسی زمانہ میں صوفیہ اور فقہا کے درمیان کھلم کھلا تصادم ہوا۔ بغداد کے قاضیوں کی عدالت میں ذوالنون بن ابراہیم مصری (م۔۲۴۰ھ/۸۵۴ء) ابوالحسن احمد بن محمد نوری، ابوحمزہ البغدادی البزاز اور منصور حلاج (م۔۳۰۹ھ/۹۲۱ء) پر ۲۶۲ھ/۷۵ء اور ۲۶۹ھ/۸۸۲ء کے درمیان مقدمے چلائے گئے۔[۳۰]

تصورِ خرقہ و بیعت:

تصور خرقہ و بیعت تصوف کے ارکان میں شامل ہیں جو باہمی طور پر ہم آہنگ ہیں اور لازم ملزوم بھی۔ خرقہ و بیعت کے بغیر کسی صوفی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ صوفیہ ان کی اسناد قرآن مجید اور

سیرت پاک پیغمبر سے پیش کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

خرقہ کو خلعت صوفیانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ خلعت اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عطا کی تھی۔ یہ واقعہ شبِ معراج کا ہے۔ قرآن حکیم کا بیان ہے:
سبحٰن الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بارکنا حوله لنریه من آیتنا انه هو السمیع البصیر (پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں، بیشک وہ پروردگار سب کی سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔)۳۲؎
ان آیات میں معراج پیغمبر کا بیان ہے، جو دو سفروں پر مبنی ہے۔ پہلا سفر مکہ سے مسجد الاقصیٰ تک اور دوسرا سفر مسجد الاقصیٰ سے آسمانوں کی جانب تھا۔ بعض مفسرین نے پہلے سفر کو اسراء کہا ہے، جس کے معنی رات کے سفر کے ہیں اور دوسرے سفر کو معراج قرار دیا ہے۔ بعضوں نے دونوں سفروں کو معراج کہا ہے۔ مسجد الحرام خانہ کعبہ کے گرد مسجد کا نام ہے۔ روایتوں میں ہے کہ یہ معراج حضرت ام ہانی دختر حضرت ابو طالب کے مکان سے ہوئی تھی۔ مسجد الاقصیٰ ہیکل سلیمانی کا نام ہے۔ یہ مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے۔ اس کی جانب رخ کر کے ابتدائے بعثت سے مکہ کی زندگی پھر مدینہ آنے پر بھی تیرہ ماہ تک نماز پڑھی گئی۔ بعض علمائے اہل تسنن اس سفر کو روح کا سفر قرار دیتے ہیں، صوفیہ بھی جمہور اسلام کی طرح جسمانی معراج کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک جسمانی معراج کی دلیل آیت مذکور میں لفظ 'عبد' کی موجودگی سے ثابت ہے کیونکہ عبد جسم و روح کے حامل فرد کو کہتے ہیں نہ کہ کسی روح کو۔

شب معراج میں اللہ تعالیٰ کی جن بعض نشانیوں کے دکھانے کا ذکر ہے، ان میں رسول اسلام کو خرقہ عطا ہونا بھی شامل ہے جن کو انھوں نے معراج سے واپسی کے بعد حضرت علی کو تفویض فرمایا اور دیگر خلفائے راشدین کی استدعا کو بحکم ربانی مسترد کر دیا۔ ۳۳؎ محمد جمال قوام نے خواجہ نظام الدین اولیاء (م۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کے چشم دید حالات درج کیے ہیں۔ ۳۴؎ انھوں نے خواجہ موصوف کی زبانی شب معراج خرقہ عطا ہونے کی حکایت اس طرح بیان کی ہے کہ شب معراج جب رسول خدا عرش سے واپس ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہو — آپ کو بہشت کے دروازے پر استادہ کیا جائے اور ایک

خلعت پہنائی جائے۔ رسول خدا نے خلعت پہن لی تو ان کے دل میں خیال گذرا کہ اس خلعت میں میری امت کو حصہ ملنا چاہئے۔ اسی وقت جبرئیل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بعد درود و سلام ارشاد فرمایا ہے ـــــ اس خلعت میں آپ کے امتیوں کو حصہ ملے گا لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ اور وہ شرط بھی بیان کر دی۔ رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور واپس آ گئے۔ صبح کو صحابہ کرام کے درمیان واقعہ معراج بیان کیا۔ جب عطائے خلعت کا ذکر آیا تو فرمایا کہ امتیوں کو خلعت میں حصہ ملے گا مگر جبرئیل کی بیان کردہ شرط کے مطابق۔ سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق نے عطائے خلعت کی درخواست کی۔ رسول اللہ نے سوال کیا کہ اس خلعت کو لے کر کیا کرو گے۔ انھوں نے جواب دیا لیکن رسول اللہ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور انھیں بٹھا دیا۔ پھر حضرت عمر فاروق نے عطائے خلعت کی درخواست کی۔ ان کے جواب سے بھی رسول اللہ مطمئن نہ ہوئے۔ تب حضرت عثمان نے عطائے خلعت کی درخواست کی لیکن ان کی درخواست بھی مسترد ہو گئی۔ سب سے آخر میں حضرت علی ابن ابی طالب نے عطائے خلعت کی درخواست کی۔ سرکار دو عالم نے دریافت کیا کہ تم اس خلعت کو لے کر کیا کرو گے۔ حضرت علی نے جواب دیا ـــ یا رسول اللہ، اس سے میں بندگان خدا کی پردہ پوشی کروں گا اور ان کے عیبوں کو ڈھانپوں گا۔ رسول اللہ نے فرمایا ـــ یہی شرط تھی اور خرقہ بہشت حضرت علی کو دے دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب خواجہ نظام الدین اولیاء بیان حکایت کی اس منزل پر پہنچے تو ان پر گریہ طاری ہو گیا اور کہنے لگے ـــ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ درویشی یہی عیب پوشی ہے!

صوفیہ اپنے مخصوص مریدین کو خرقہ عطا کرتے ہیں۔ یہ خرقہ اون کا منفرد لباس ہے، جس کو صوفیہ پہنتے ہیں جو عام طور پر بوسیدہ و پیوند زدہ گدڑی ہوتی ہے۔ حدیث رسول الثقلین ہے: علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم (اون کا لباس اختیار کرو، اس سے تم اپنے اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے) ۳۵ حضرت ابو ذر غفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سرکار دو عالم حضرت محمد رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت سرکار دو عالم سفید کپڑے پہنے ہوئے سو رہے تھے۔ ۳۶ سفید کپڑوں سے کفن کا تصور وابستہ ہے۔ شیخ علی ہجویری کا بیان ہے کہ اہل طریقت میں جو صوفیہ گدڑی کا پہننا یا اپنے مریدوں کو پہنانا ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک گدڑی پہننا

کفن پہننے کے مترادف ہے بلکہ اس کی شرطیں وہی ہیں جو کفن پہننے کی ہیں۔ انسان دنیا سے دست کش ہو کر کفن پہنتا ہے۔ اس لیے اہل خرقہ کو دنیا اور اس کی لذتوں سے بے نیاز ہو جانا چاہئے اور اپنی تمام عمر اللہ تعالیٰ کی خدمت گذاری میں صرف کر دینا چاہئے۔ اس طرح خرقہ پوشی مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کی شناخت ہے۔ ۳۷

مشائخ صوفیہ نے عطائے خرقہ کے ضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ ہر صوفی عطائے خرقہ کا مجاز نہیں ہوتا۔ فقط وہی صوفی خرقہ عطا کر سکتا ہے، جس کو شیخ کامل سے اجازہ حاصل ہو۔ مشائخ صوفیہ کا دستور تھا کہ کوئی طالبِ عقبیٰ ان سے تعلق پیدا کرتا تو اسے تین برسوں تک آدابِ تصوف کی تعلیم دیتے۔ ایک برس مخلوقات کی خدمت میں، ایک برس حکم خدا و رسول بجالانے میں اور ایک برس اپنے نفس کی حفاظت و پاسبانی میں۔ اگر وہ شخص اپنے طلبِ صادق میں کامیاب ہوتا تو خیر، ورنہ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تجھے طریقت قبول نہیں کرتی۔ ۳۸ مشائخ صوفیہ نے خرقہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ تبرک، محبت، محبت اور ارادت۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کہتے ہیں کہ شیخ کامل ان چار خرقوں میں کون سا خرقہ کس مرید کو عطا کرتے ہیں، یہ ایک راز ہے جو حق تعالیٰ اور شیخ کامل کے درمیان ہے اور کسی کو خبر نہیں۔ عام طور پر مرید کو خرقہ ارادت درجہ کمال پر فائز ہونے کے بعد ہی عطا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ درجہ کمال پر فائز کسی بزرگ کو ابتداء میں ہی خرقہ ارادت حاصل ہو گیا ۳۹ اس ارادت کے تین پہلو ہیں—بطحہ، حرم اور کعبہ۔ ارادت کا بطحہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی کو آزار نہ پہنچے دے — کسی کو برا نہ کہے۔ نہ سنے اور اپنے ظاہر کی نگہداشت کرتا رہے۔ ارادت کا حرم یہ ہے کہ آنکھ، زبان اور ہاتھ سے شرع کی نگہداشت کرے اور دل کو یادِ حق سے وابستہ کرے، ہمیشہ ذکر و تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے اور ارادت کا کعبہ یہ ہے کہ اپنے باطن کی حفاظت کرے اور شیطانی وسوسوں سے دور رہے۔ ۴۰

'بیعت' عربی لفظ 'بیع' سے مشتق ہے جس کے معنی تجارت کے ہوتے ہیں۔ قرآنی ارشاد ہے: فاستبشروا ببیعکم الّذی بایعتم بہ (اب تم لوگ اپنی تجارت پر خوشیاں مناؤ۔) ۴۱ اسی آیت کریمہ میں 'اشتریٰ' بھی ہے جس کے معنی خریدنا کے ہیں، ان اللہ اشتریٰ من المومنین

انفسهم واموالهم بانّ لهم الجنّة (بیشک اللہ نے صاحبان ایمان سے ان کے جان ومال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) یہی معاملہ بیعت بھی ہے کہ اہل ایمان اپنے جان ومال کو جنت کے عوض فروخت کر دیتا ہے۔ قرآن میں بیعت کا ذکر موجود ہے: لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذیبایعونك تحت الشّجرة (یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔ ۴۲ واقعہ کو 'بیعت الرضوان' کے نام سے جانا جاتا ہے جو فتح مکہ (۸ھ/۶۲۹ء) کے موقع پر رونما ہوا۔ یہ بیعت رسول اسلام نے لی تھی۔ اصحاب میں ایک ایک کر کے تمام لوگ آئے تھے اور رسول اسلام کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ بیعت مکہ پر حملہ کرنے میں ثابت قدم رہنے کی غرض سے لی گئی تھی۔ بروایت دیگر بعض اصحاب رسول جو پہلے بیعت کر چکے تھے، دوبارہ بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اللہ نے دریافت کیا کہ تم بیعت کر چکے تھے، پھر کیوں آئے ہو۔ لوگوں نے عرض کیا، تجدید بیعت چاہتے ہیں۔ رسول اللہ نے اپنا دست مبارک بڑھادیا۔ اور انھوں نے دوبارہ بیعت کی۔ تجدید کی ضرورت پیدا ہونا واضح کرتا ہے کہ پہلی بیعت کسی بنا پر مشکوک ہو گئی تھی۔ جیسا کہ تجدید وضو اسی صورت میں کرتے ہیں، جب حالتِ وضو میں ہونا مشکوک ہو جائے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کا ذکر ہے، جو تجدید بیعت سے واضح ہو جاتا ہے کہ بیعت الرضوان میں شامل ہو جانے سے ہمیشہ کے لیے رضی اللہ، ہونے کی سند نہیں ملتی، بلکہ آئندہ کے اعمال کے اعتبار سے تجدید یا تنسیخ ممکن ہے۔ مشائخ صوفیہ جو تجدید بیعت کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کی سند اسی واقعہ بیعت الرضوان سے اخذ کرتے ہیں خواجہ نظام الدین اولیاء نے ہدایت کی ہے کہ لازمی طور پر کچھ مدت کے بعد تجدید بیعت کرنا چاہیے۔ اگر شیخ موجود نہ ہو تو اس کے خرقہ یا اس سے حاصل کی ہوئی کوئی چیز سامنے رکھ کر تجدید بیعت کر لینا چاہئے تاکہ راہ سلوک میں استحکام رہے۔ ۴۳

روحانی سلاسل:

صوفیہ کے عقیدت کے مطابق نظام عالم کی ایک مخصوص اساس ہے۔ طبقات رجال الغیب یعنی دنیا اس لیے قائم وباقی ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور و منظم روحانی سلسلہ کی شفاعت کی

بدولت تمام آفات ارضی و سماوی ٹلتی رہتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ شفاعت نہ ہو تو دنیا فنا ہو جائے۔ ولی کا تقرر منصوص من الولی ہوتا ہے۔ ایک ولی اپنی جگہ پر دوسرے ولی کو مقرر کرتا ہے۔ ایک ولی کی وفات پر دوسرا ولی اس کی جگہ لیتا ہے۔ اس میں کسی شوریٰ یا اجماع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر زمانہ کے لیے اولیاء کی تعداد مقرر ہے۔ تین سو نقباء، چالیس ابدال، سات اُمنہ، چار عمون اور ایک قطب یا غوث۔ قطب یا غوث ہی وہ مرکز ہے، جس کے گرد سارا نظام کائنات گردش کرتا ہے۔ یہی سلسلہ شفاعت ہے جس سے روحانی سلاسل بنتے ہیں۔

ہندوستان میں صوفیہ کے روحانی سلاسل کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ صوفیہ بیک وقت کئی روحانی سلاسل کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو کسی ایک سلسلہ کی بجائے کئی سلسلوں میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ مزید براں اگر کوئی صوفی کسی بنا پر ممتاز ہو جاتا ہے تو اس کے نام سے نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ابوالفضل نے صوفیہ کے چودہ سلسلے بیان کیے ہیں جو اس وقت کے ہندوستان میں مروج تھے لیکن ان چودہ سلاسل میں قادریہ و نقشبندیہ دو الگ الگ سلسلے نہیں ہیں۔ البتہ شہزادہ دارا شکوہ نے ان کی تعداد محض چھ قرار دی ہے— قادریہ، خواجگان، چشتیہ، کبرویہ، سہروردیہ اور متفرقہ لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف مندرجہ ذیل چھ سلاسل نے کارنامے انجام دیے اور وہ ہیں— چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، نقش بندیہ اور فردوسیہ۔ ۴۴ ہمارے نزدیک یہ بیان درست نہیں ہے۔ سلسلہ فردوسیہ بھی سلسلہ ہمدانیہ کی طرح سلسلۂ کبرویہ کی شاخ ہے۔ اگر فردوسیہ کی بجائے وہ سلسلۂ کبرویہ کہتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن اگر فردوسیہ کا ذکر ہوگا تو ہمدانیہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سلسلۂ جنیدیہ کے ذیل میں فقط سلسلہ قادریہ کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ شیخ ابوالخیر طاوسی کا سلسلۂ طاؤسیہ، شیخ احمد کبیر رفاعی کا سلسلۂ رفاعیہ اور شیخ ابوالفضل بن عبدالمنعم کا سلسلۂ منعمیہ بھی ترک ہو گیا ہے۔ شیخ عبداللہ برکی کے سلسلہ کے بیان میں مداریہ اور قلندریہ کا ذکر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سلسلہ اویسیہ کا ذکر بھی شامل نہیں ہے جس کی شمولیت کے بغیر صوفیہ کا کوئی روحانی سلسلہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ سلسلۂ اویسیہ کے شیخ ابو اسحٰق کازرونی کی خانقاہیں ہندوستان سے چین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حیرت ہے کہ پروفیسر موصوف کو کہیں نظر نہ آئیں! عصر

حاضر میں ہندوستان میں صوفیہ کے چودہ سلاسل زیادہ مروج ہیں جن کے نام ہیں: چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقش بندیہ، شطاریہ، فردوسیہ، ہمدانیہ، مداریہ، نعمت الٰہیہ، قلندریہ، طاؤسیہ، رفاعیہ، منعمیہ اور اویسیہ۔ اوّل الذکر چاروں سلسلوں میں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کے کئی کئی ضمنی سلسلے ہیں، جن کی اپنی اپنی انفرادیت ہے لیکن یہاں ان کا الگ سے ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

صوفیہ اپنا روحانی رشتہ براہ راست پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلعم سے قائم کرتے ہیں پھر حضرت علی ابن ابی طالب سے۔ ایک مختصر سی جماعت حضرت ابو بکر صدیق سے۔ گم شدہ سلاسل خواجہ اویس قرنی سے۔ ہندوستان کے تمام صوفی سلسلے انھیں بزرگوں سے منسوب ہیں۔ ان میں زیادہ تر حضرت علی ابن ابی طالب سے روحانی سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ صوفیہ کی قدیم ترین اسناد کی حیثیت سے خلدی (م۔ ۳۴۸ھ / ۹۵۹ء) کی 'الفہرست' کو قبول کیا جاتا ہے۔ خلدی نے سات واسطوں سے پیغمبر اسلام کا ذکر کیا ہے: جنید، سقطی، معروف کرخی، فرقد، حسن بصری، انس بن مالک اور علی ابن ابی طالب۔ ۵؎ دقاق (م۔ ۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء) نے بھی اپنے سلسلہ کے صوفیہ کا ذکر کیا ہے، جو خلدی کے بیان کردہ ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ البتہ انھوں نے معروف کرخی سے قبل داود طائی کا نام لیا ہے ۶؎ عصر حاضر میں 'عیون' کو متفقہ اسناد کی حیثیت حاصل ہے، جس کو صوفیہ کے تمام بڑے سلسلے قبول کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے: علی ابن ابی طالب، حسن بصری، حبیب عجمی، داود طائی، جرجانی، مغربی، ابو علی کاتب یازجانی، روذباری اور پھر جنید بغدادی ۷؎ ابن الجوزی اور ذہبی نے اس سلسلہ روحانی پر اعتراض کیا ہے کہ اولین چاروں ولیوں کی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بعضوں کے نزدیک خواجہ معروف کرخی کے روحانی سلسلہ کو بکر بن خنیس، ثابت البنان کے واسطے سے خواجہ حسن بصری تک پہنچانا زیادہ درست ہے۔ اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ خواجہ حسن بصری حضرت علی سے براہ راست بیعت نہیں تھے بلکہ ایک صحابی عمران بن حصین الخزاعی (م۔ ۵۳ھ / ۶۷۲ء) کے واسطے سے مرید تھے۔ شجرۂ طریقت صدیقیہ کی قدامت شیخ عبد اللہ علمبردار مکی سے وابستہ ہے جو سرکار دو عالم کے غلاموں میں تھے۔ ہندوستان میں طریقت صدیقیہ کو سلسلۂ خواجگان اور سلسلۂ نقش بندیہ کی بناء پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طرح سلسلۂ اویسیہ بھی ہندوستان میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔ طریقت کے اہم

ترین روحانی شجرے اپنی جگہ پر پیش کیے جائیں گے۔

صوفیہ کے مسالک :

صوفیہ کی روایت رہی ہے کہ بیک وقت کئی سلاسل سے بیعت میں رہتے ہیں۔ اہل فقہ اصرار کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان بس ایک فقہ کا پابند ہو سکتا ہے۔ اگر حنفی ہے تو بس فقہ امام ابو حنیفہ کا پابند رہے گا، کسی مسئلہ میں دیگر فقہوں سے استنباط نہیں کر سکتا اور یہی صورت حال دیگر فقہوں کے لیے بھی ہے۔ لیکن صوفیہ بعض مباحث میں ایک سلسلہ کے پابند ہیں تو دوسرے مباحث میں کسی دسرے سلسلے کے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے مسالک کا ذکر کر دیا جائے۔ شیخ علی ہجویری نے انھیں گیارہ فرقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے 'مسلک' کو 'مذہب' کہا ہے۔ ان میں بیشتر مذاہب ہندوستانی صوفیہ میں مروج رہے ہیں۔

شیخ موصوف کے نزدیک ذیل میں درج گیارہ فرقوں میں دس مقبول و اہل حق ہیں۔ باقی ایک آخر الذکر مردود و اہل باطل ۸ ہے چونکہ عصر حاضر میں مذہب یا فرقہ کو مخصوص اصطلاحوں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، اس لیے ہم انھیں صوفیہ کا مسلک کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ ذیل میں ان کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

ا۔ مسلک محاسبی :

مسلک محاسبی کے موسس شیخ ابو عبد اللہ حارث بن اسد محاسبی ہیں۔ اپنے زمانہ میں مقبول النفس اور مقتول النفس مشہور تھے۔ انھوں نے ظاہری و باطنی کلام میں توحید پر زیادہ زور دیا۔ شریعت الٰہی اور سنت رسول کے انتہائی پابند تھے۔ ان کے نزدیک مقامات تصوف میں پہلا مقام 'توبہ' ہے یعنی سابق کی نافرمانیوں سے باز رہنا اور ان کی تلافی کا خلوص دل سے عہد کرنا۔ دوسرا مقام 'انابت' ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب خشوع و خضوع سے رجوع ہونا۔ تیسرا مقام 'زہد' ہے یعنی ترک ماسوا اللہ۔ چوتھا مقام 'توکل' ہے یعنی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ۔ اسی منزل سے 'رضا' کے حصول کا راستہ کھلتا ہے لیکن 'رضا' مقامات تصوف میں کوئی الگ مقام نہیں ہے بلکہ اس کے احوال میں سے ہے۔ اس کی منزلیں مسلسل

مجاہدہ سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ کسی ایک منزل پر آسودہ ہو جانے سے نہیں بلکہ جس منزل سے گذر رہا ہو، اس کے تمام لوازمات و مقتضیات کو اچھی طرح سمجھے، دل سے قبول کرے اور ادا کرے۔

۱۔ مسلک طیفوری :

اس مسلک کے پیشوا خواجہ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامی (م۔ ۲۳۴ھ یا ۲۶۱ھ / ۸۴۸ء یا ۸۷۴ء) ہیں۔ ان کی طریقت میں 'سکر' (بے ہوشی) کو اساسی حیثیت حاصل ہے ۔ 'سکر' کی حالت 'صحو' (ہوش) سے افضل ہے۔ کیونکہ 'سکر' میں بندہ اپنے خدا میں گم اور تمام علائق دنیا سے بے نیاز و بے خبر ہوتا ہے۔ البتہ اہل طیفور اس مسئلے میں اختلاف کرتے ہیں کہ مجاہدہ سے سکر کی حالت میں پہنچا جا سکتا ہے یا نہیں یا مصنوعی سکر اختیار کرنا درست ہے یا نہیں۔ ہندوستان میں سلسلۂ شطاریہ سے اس مسلک کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

۲۔ مسلک جنیدی :

اس مسلک کے رہنما خواجہ ابو القاسم جنید بن محمد بغدادی (م۔ ۲۹۸ھ / ۹۱۰ء) ہیں ۔ یہ مسلک اہل صوفیہ میں سب سے زیادہ معروف و مقبول رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلک جنیدی کے کئی روحانی سلاسل رشد و ہدایت کے منارۂ انوار ہدایت کی حیثیت سے قائم ہیں۔ جن میں سلسلۂ چشتیہ، سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ سہروردیہ، سلسلۂ طاؤسیہ، سلسلۂ رفاعیہ اور سلسلۂ منعمیہ کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے مسلک جنیدی میں مسلک طیفوری کے برعکس 'صحو' (ہوش) کو 'سکر' (بے ہوش) پر فضیلت حاصل ہے۔ شیخ علی ہجویری نے 'سکر' کو بچوں کے کھیل کی جگہ اور 'صحو' کو مردوں کے فنا کا میدان قرار دیا ہے۔ ۴۹ عالم سکر میں انسان عقل، تمیز اور علم کھو دیتا ہے اسے نیک و بد کی تمیز نہیں رہ جاتی۔ غور کرنے اور حقیقت کے عرفان کے لیے عقل و ہوش یعنی 'صحو' کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاہدہ کے لیے 'صحو' لازمی ہے۔

۳۔ مسلک نوری :

اس مسلک کے بانی خواجہ ابوالحسن احمد بن نوری ہیں۔ اس مسلک میں دوسروں کے حقوق و منفعت پر اپنے حقوق و منفعت کو قربان کر دینا فرض قرار دیا گیا ہے۔ درویشوں کی صحبت میں رہنا لازمی ہے۔ گوشہ نشینی کی ممانعت ہے۔ اس فرقہ کی اساس 'ایثار' ہے۔

۴۔ مسلک سہیلی :

اس مسلک کے رہبر خواجہ سہیل بن عبد اللہ تستری (م۔ ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء) ہیں۔ اس مسلک میں مجاہدۂ نفس اور ریاضت کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طریق میں اجتہاد کو لازمی عنصر قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بار صحابہ کرام میں سے کسی نے سوال کیا— یارسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ ارشاد ہوا— اپنے نفس امارہ کے خلاف مجاہدہ کرنا۔ مجاہدۂ نفس کے معنی اسے 'ہوا' (خواہش) سے روکنا اور دور رکھنا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک، خواہشِ لذت و شہوت: جو فرد کی اپنی ذات محدود تک ہوتی ہے: عام لوگ فتنہ و شر سے مامون و محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری خواہش مرتبہ و ریاست ہے: جس کی لپیٹ میں عام انسان تو درکنار، اہل ایمان بھی محفوظ و مامون نہیں رہتے۔ اس خواہش کا اسیر خود گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

۶۔ مسلک حکیمی :

یہ مسلک خواجہ ابو عبد اللہ محمود بن علی حکیم ترمذی سے منسلک ہے۔ اس میں ولایت کو اساسی درجہ حاصل ہے۔ اس کے متعلق مخصوص عقاید ہوتے ہیں۔ مثلاً ولی ہر دور میں ہوتا ہے۔ اولیاء تمام مخلوقات میں برگزیدہ ہوتے ہیں۔ ان کا نفس مرضی الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔ ولی ہی حقیقت کا علم رکھتے ہیں۔ وہی اپنی کرامت ظاہر کر سکتے ہیں لیکن ولی کو نبی کا ہمسر نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ ولی غیر معصوم ہوتے ہیں۔ ولی کو شریعت میں تبدیلی کا مجاز نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ شریعت اسلام کے اسی طرح یا اس سے زیادہ پابند ہوتے ہیں، جتنا کہ عام انسان۔

۷۔ مسلک خرازی :

اس مسلک کی ابتدا خواجہ ابو سعید احمد بن عیسیٰ خراز (م۔۲۸۷ھ/۹۰۰ء) سے ہوتی ہے۔ انھوں نے 'فنا' اور 'بقا' کی اصطلاحیں جاری کیں جن سے مختلف و متضاد عقاید پیدا ہوئے۔ بعضوں نے 'فنا' سے مراد اپنی ذات و ہستی کو مٹا دینا قرار دیا تاکہ وہ خدا سے متحد و پیوست ہو جائے — عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا! اس کو دوسری اصطلاح میں 'حلول' کہیں گے۔ اس کے مخالف دلیل پیش کرتے ہیں کہ قدیم و محدث یا خالق و مخلوق یا صانع و مصنوع کا امتزاج ممکن نہیں ہو سکتا۔ انسان کا وجود فنا ہو کر خدا کے وجود میں حلول نہیں کر سکتا کیونکہ کوئی بھی شخص صفات الٰہی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ شیخ علی ہجویری کے نزدیک اس قسم کا عقیدہ صریحی کفر ہے۔ انھوں نے 'فنا' اور 'بقا' کی اصطلاحات کی یوں وضاحت کی ہے: علم کے میدان میں 'فنا' کا مفہوم دنیا کو مع متعلقات عارضی فنا ماننا اور 'بقا' کا مطلب ہے کہ عقبیٰ اور جو کچھ خدا کے پاس ہے 'وہی باقی رہے گا۔ عمل کے میدان میں 'فنا' و 'بقا' سے مراد اپنی جہالت، غفلت، نافرمانی اور خواہشات نفس کو فنا کر دینا۔ تا آنکہ خدا کا علم و ذکر و اطاعت ہی اس کے ساتھ باقی رہ جائے یہی 'بقا' ہے۔ انسان اپنی حیاتِ مستعار کو مقصود زندگی نہ بنائے جو فنا ہو جائے گی بلکہ اپنی تمام تر توجہ اور سعی و جہد کا مرکز و محور آخرت کو قرار دے جو بہتر ہے اور 'بقا' کی حامل ہے۔ خیرٌ وَابقیٰ ۵۰

۸۔ مسلک خفیفی :

یہ مسلک خواجہ ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی (م۔۳۷۱ھ/۹۸۱ء) سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے جنسیت کی پاکیزگی کا تصور پیش کیا۔ موصوف کسی شاہی خاندان کی فرد تھے۔ توبہ سے قبل چار سو عورتوں سے مباشرت کی تھی۔ بعدہٗ تصوف کی جانب مائل ہوئے۔ بیشمار صوفیہ سے ملاقات و اکتساب فیض کیا جن میں شیخ ابن عطا' شیخ ابو بکر شبلی اور شیخ حسین بن منصور اہم ہیں۔ ان کے نزدیک حصول توحید کے لیے بے نیازی لازمی شرط ہے۔ اگر انسان اپنے نفس امارہ کو تابع کر لے تو دنیا کی کوئی طاقت توحید سے منحرف نہیں کر سکتی۔ بعد توبہ موصوف نے جنسیت کو ایک اور زاویہ عطا کیا — چالیس

عورتوں سے عقد کیا اور بغیر مقاربت کیے طلاق دے دی۔ان کے سینے سے ناف تک پیٹ میں بارہ گرہیں تھیں، جن کو صبر کی گرہیں کہتے تھے۔ مسلک خفیفی میں 'غیبت' اور حضور' کی اصطلاحات کے ذریعہ وہی تصورات پیش کیے، جو مسلک خرازی نے 'فنا' اور 'بقا' کے ذریعہ بیان کیے۔ 'غیب' سے مراد ہے کہ انسان ماسوااللہ ہر شے سے حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی غائب ہو جائے صرف بحق باری تعالیٰ حاضر رہے۔

۹۔ مسلک سیاری :

یہ مسلک خواجہ ابو العباس سیاری سے منسوب ہے۔ ان کا تصوف 'جمع' اور 'تفرقہ' کی اصطلاحات سے سمجھا جاسکتا ہے۔ان اصطلاحات کا استعمال صوفیہ میں مسلک محاسبی کے علاوہ فقہا اور نحوی بھی کرتے ہیں لیکن ان کا استنباط مختلف النوع ہے۔ مسلک سیاری کے نزدیک 'جمع' اپنے اوصاف سے جمع ہونا اور 'تفرقہ' اپنے اعمال سے جدا ہونا ہے۔ یعنی فرد خدا کے پسندیدہ اوصاف وافعال کا حامل ہو اور ارادہ و تصرف کی آزادی ، جو اللہ تعالیٰ نے فرد کو عطا کی ہے، اس سے دست بردار ہو جائے تو اس کو 'جمع' کی حالت میں ہونا کہتے ہیں۔ اور اگر اس میں خدا کے پسندیدہ اوصاف وافعال ہیں بلکہ اس کے اوصاف وافعال اور خدا کے پسندیدہ اوصاف وافعال میں تناقص و تفرقہ پایا جاتا ہے تو اس کو 'تفرقہ' کی حالت میں ہونا کہیں گے۔

جمہور صوفیہ کے نزدیک جمع سے 'مواھب' اور تفرقہ سے 'مکاسب' مراد لے جاتے ہیں۔ یعنی بندہ کو جو کچھ کسب و مجاہدہ اور سعی و جہد سے حاصل ہوتا ہے وہی 'تفرقہ' ہے اور جو کچھ بلا کسب و مجاہدہ اور سعی و جہد کے حاصل ہو جائے، بلکہ محض لطف خداوندی سے بطور عطیہ مرحمت ہو، وہی جمع ہے۔ شیخ علی ہجویری اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں کہ جب تک انسان زندہ و سلامت ہوتا ہے، کسب و مجاہدہ سے جدا نہیں ہو سکتا۔ عام قاعدہ ہے کہ مجاہدہ مقدم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ہدایت و مواھب حاصل ہوتے ہیں۔ان کا باہمی تعلق وہی ہے جو انور کا آفتاب سے، عرض کا جوہر سے، صفت کا موصوف سے اور طریقت کا شریعت سے ہوتا ہے۔[۵۱]

۱۰۔ مسلک قصاری یا مسلک ملامتی :

مسلک قصاری خواجہ ابو صالح بن حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار سے (م۔۲۷۱ھ/ ۸۸۴ء) منسوب ہے۔ ان کا طریقہ ملامت کا اظہار و اشاعت ہے کیونکہ تزکیہ نفس کے لیے ملامت خلق ناگزیر ہے۔ شریعت کی خلاف ورزی کیے بغیر ظاہری طور پر ایسا رویہ اختیار کرنا کہ لوگ اس کی ملامت کریں اور درپے آزار ہو جائیں۔

اہل ملامت کے خیال میں اہل دنیا کے لیے محبت اور خاصان خدا کے لیے ملامت ضروری شرطیں ہیں کیونکہ کسی شخص کا بغیر کسی خطا و گناہ کے لوگوں کی ملامت کا تختۂ مشق بننا، اس شخص کے مقبول بارگاہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی مثال رسول اسلام کی حیات طیبہ سے پیش کرتے ہیں کہ جب تک لوگوں کو ان کے اللہ تعالیٰ سے خلعت محبوبیت سے سرفراز ہونے کا علم نہیں تھا، ان کے بے حد مداح و معترف تھے لیکن جب انھیں سرکار دو عالم کی عظمتیں معلوم ہو گئیں تو وہی لوگ زبان طعن و ملامت دراز کرنے لگے۔ اہل ملامت قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ صفت ملامت ہی صفتِ مومنین ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ ہو: ولایخافون لومة لائم ذالك فضل الله یوتیه من یّشاء واللّٰه واسع علیم (اور کسی ملامت کرنے والے کو ملامت کی پروا نہ کرنے والی ہو گی۔ یہ فضل خدا ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ صاحب وسعت او علم و دانا بھی ہے۔) ۵۲

اہل ملامت کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو نفس لوامہ عطا کیا ہے تاکہ طالبان حق کو برابر ملامت کرتا رہے۔ اگر بندہ نیک و خیر کرے تو اس کے نقائص پر ملامت کرے اور اگر بدی کرے تو اس کے ارتکاب پر ملامت کرے۔ یہ انتظام اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بعد پیدا کرنے میں عجب و غرور سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہو سکتی اور ملامت عجب و غرور کی بیخ کنی کر دیتی ہے۔ غرور و تمکنت پیدا ہونے کے دو اسباب ہیں اوّلاً یہ کہ اس کا کوئی کام لوگوں کو پسند آیا اور تعریف و ستائش ہونے لگی یا ثانیاً یہ خود اس کام کی بنا پر وہ اپنی ذات پر غرور کرنے لگا۔ اِدھر بندہ غرور میں مبتلا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن شیخ علی ہجویری کے نزدیک ملامت کی خواہش درست نہیں بلکہ عین

ریا ہے اور ریا عین نفاق ہے۔ سچا درویش وہ ہے جو غیر اللہ سے دلچسپی اور سروکار ہی نہ رکھے۔ ۵۳

۱۱۔ مسلک حلولی :

اس مسلک کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کے موجد شیخ ابو حلمان دمشقی اور دوسرے گروہ کے رہنما شیخ فارس ہیں۔ مسلک میں حلولیہ بندہ کی روح کا خدا کے ساتھ حلول وامتزاج ممکن ہے۔ ان کے نزدیک بندہ کا معراج کمال ہے کہ اس کی روح کو خدا کے ساتھ حلول وامتزاج حاصل ہو جائے۔ یہی عقیدہ بدھوں کا ہے، جو اس کو 'نروان' کہتے ہیں۔ صوفیہ کے بعض دیگر مسالک بھی عقیدۂ اتحاد کے قائل ہیں، جن کے عقاید اور حلولیت میں کئی اعتبار سے مماثلت ہے۔ اس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔ ہندوستانی صوفیہ کی جمہور حلولیوں کو خدا کے شیدائیوں میں شمار کرتی ہے لیکن شیخ علی ہجویری ان کو کافر اور مردود گردانتے ہیں اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔ انھوں نے صوفیہ کو ہدایت کی ہے کہ ان گمراہ لوگوں سے علاحدگی اور برأت اختیار کریں کیونکہ ان کے تصورات سے اسلام اور طریقت سے بدگمانی اور تنفر پیدا ہوتا ہے۔ ۵۳

بعض روحانی اصطلاحات :

گذشتہ صفحات میں صوفیہ کے مختلف مسالک کی مخصوص اصطلاحات کا ذکر آچکا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ان دیگر اصلاحات کا ذکر بھی کردیا جائے، جن کو صوفیہ کے مختلف مسالک بلا کسی تفریق کے استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان اصطلاحات کی اپنی الگ دنیا ہے۔ شیخ علی ہجویری رقم طراز ہیں— اہل تصوف وطریقت کا اصل مشن تھا کہ لوگوں کے اندر اس حقیقی دینداری اور خدا پرستی کی اصل روح بیدار اور جاری وساری کی جائے جو انبیا علیہم السلام کی دعوت حق کا اصل مقصود تھی لیکن یہ بات جابر وظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کو گوارہ نہ تھی۔ اس لیے صوفیہ اپنی بات ایسی اصطلاحات میں بیان کرتے تھے کہ ان کے اپنے طائفہ کے لوگ تو اسے اچھی طرح سے سمجھ لیں لیکن اگر یہ بات ان کے حلقہ سے باہر جائے تو دوسرے اس سلسلے کے بھید کو نہ پاسکیں۔ ۵۴ شیخ موصوف نے مختلف ومتعدد اصطلاحات کی وضاحت کی ہے، جن میں فقط چند کا ذکر یہاں کیا جاسکتا ہے جو جمہور صوفیہ میں رائج

ومقبول ہیں۔ ان اصطلاحات کو صوفیہ کی 'رمزی لغت'(Code Word) کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱)'وقت' اور 'حال': 'وقت' کے معنی رب سے وصل کی حالت ہے، جب بندہ اپنی ہستی سمیت مع دنیا ومافیہا گم ہو جاتا ہے۔ اسی عالم میں اسے کشف واسرار حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ خدا کے عطا کردہ 'وقت' کی قدر پہچان لے تو اس پر 'حال' طاری ہو جاتا ہے۔ 'حال' بندے پر 'وقت' کے دوران وارد ہوتا ہے۔ جب تک 'حال' قائم رہے گا' تمام 'وقت' ہو جائے گا اور اگر 'حال' وارد نہ ہو تو 'وقت' ضایع ہو جائے گا۔

(۲)'مقام' اور 'تمکین': ہر شخص اپنی فہم وادراک، ذوق وشوق اور ادائیگی حقوق میں مختلف مقامات رکھتا ہے۔ پہلے ایک مقام پر ہوتا ہے، پھر ترقی کر کے دوسرے مقام پر پہنچتا ہے۔ 'تمکین' بارگاہِ الٰہی میں بلند ترین درجہ کمال ہے۔ اہل مقامات مختلف 'مقامات' طے کر کے درجہ تمکین تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

(۳)'محاضرہ' اور 'مکاشفہ': 'محاضرہ' حضور دل کو کہتے ہیں۔ گویا بندہ محسوس کرے کہ وہ خداوند عزوجل کے حضور میں حاضر ہے۔ 'محاضرہ' سے 'مکاشفہ' حاصل ہوتا ہے۔ 'مکاشفہ' اسرار الٰہی سے واقف ہونے کو کہتے ہیں۔ تامل وتفکر کے ذریعہ محاضرہ میں مکاشفہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی علامت حیران ومتجسس رہنا بیان کیا گیا ہے۔

(۴)'بسط' اور 'قبض': بسط کے معنی کھلنے اور کشادہ وسیع ہونے اور 'قبض' کے معنی سکڑنے اور بند ہونے کے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں مختلف کیفیات ہیں۔ جن سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات طبیعت مائل ہوتی ہے اور دقیق ومشکل ترین مسائل ومعاملات بآسانی حل ہو جاتے ہیں اور کبھی طبیعت مائل نہیں ہوتی تو آسان ترین مسائل ومعاملات بھی بڑی کوشش سے حل نہیں ہوتے۔ طبیعت کے مائل ہونے کی کیفیت کو 'بسط' اور مائل نہ ہونے کی کیفیت کو 'قبض' کہتے ہیں۔

(۵)'ہیبت' اور 'انس': 'ہیبت' اللہ تعالیٰ کے جلال وخوف کی حالت ہے اور 'انس' اس کے حسن وجمال اور رحمت وعنایت کی وجہ سے محبت وشیفتگی کی حالت ہے۔ بعض صوفیہ کے نزدیک 'ہیبت'

عارفوں کا درجہ ہے اور 'انس' مریدوں (ابتدائی درجہ کے مسافروں کا اور درجہ ہے کیونکہ حصولِ معرفت کے بعد اللہ تعالیٰ کی عظمت کے احساس سے ہیبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر 'انس' اپنے ہم جنسوں سے پیدا ہوتی اور اللہ تعالیٰ انسانوں کا ہم جنس نہیں ہے)

(۶) 'قہر' اور 'لطف': 'قہر' کے معنی اپنی خواہشوں کو ختم کر کے مشقت و ریاضت کی زندگی گذارنے کے ہوتے ہیں اور 'لطف' میں نعمت و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں رضائے الٰہی کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ صوفیہ میں بعضے 'قہر' کو افضل قرار دیتے ہیں اور بعضے 'لطف' کو۔ دونوں طرح کے صوفیہ قرآن الحکیم سے استنباط کرتے ہیں۔

(۷) 'نفی' اور 'اثبات': 'نفی' کے معنی اپنی نفسانی صفات (مذموم و ناپسندیدہ) کو اپنے باطن سے دور کرنے اور مٹا دینے اور 'اثبات' کے معنی خود پر حقیقت کو غالب کر کے خصائل محمودہ کی ابتدا' نمو اور ثبت کو کہتے ہیں۔ نیز 'نفی' کے معانی اپنے اختیارات کی 'نفی' اور 'اثبات' کے معانی اللہ تعالیٰ کے اختیارات کو ثابت کرنا ہوتے ہیں۔

(۸) 'مسامرہ' اور 'محادثہ': رات کی مناجات کو 'مسامرہ' اور دن کی دعاؤں کو 'محادثہ' کہتے ہیں۔

(۹) 'علم الیقین'، 'حق الیقین' اور 'عین الیقین': 'علم الیقین' سے مراد ہے کہ علمی دلائل و براہین سے حقیقت کا یقین ہونا ہے۔ یہ علمائے عظام کی منزل ہے۔ اس کے بعد کی منزل 'حق الیقین' ہے کہ اپنے نفس میں پوشیدہ آثار و روایات کے مشاہدہ سے حقیقت کا یقین کرنا۔ یہ اولیاء کرام کی منزل ہے۔ اس کے بھی بعد کی منزل 'عین الیقین' ہے کہ اگر تمام حجابات و اسرار اٹھا دیے جائیں تو اس صورت میں بھی یقین میں اضافہ نہ ہو سکے۔ یہ عارفِ کامل کی منزل ہے۔ حضرت علی کا قول مشہور زمانہ ہے کہ اگر کائنات کے تمام حقایق و اسرار کے پردے اٹھا دئے جائیں تو اس صورت میں بھی نہ تو میرے علم اضافہ ہوگا نہ یقین میں۔

(۱۰) 'علم' و 'معرفت': 'علم' کے معنی کسی چیز کو جاننے اور 'معرفت' کے معنی 'علم' کو زندگی کا جزو لاینفک بنانے کے ہوتے ہیں۔ عالم اپنے علم کو زبان سے اور عارف علم کو اپنے حال سے بیان کرتا ہے۔

(۱۱)'شریعت' اور 'حقیقت': 'شریعت' سے شریعت اسلامی اور 'حقیقت' سے طریقِ صوفیہ مراد ہے۔ بعض صوفیہ جو قرامطہ، مشتبہ، مشبعہ اور موسوسان سے متاثر ہیں، 'شریعت' اور 'حقیقت' (طریقت) کو الگ الگ چیزیں مانتے ہیں۔ ان کو گمان ہے کہ اگر بندہ پر 'حقیت' منکشف ہو جائے تو شرعی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اسے 'شریعت' سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر صوفیہ اقرار و تصدیق کی طرح 'شریعت' اور 'حقیت' (طریقت) کو لازم و ملزوم اور باہم لاینفک قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک احکام شریعت کو خلوص نیت سے انجام دینے کا دوسرا نام ہی طریقت ہو سکتا ہے۔

(۱۲)'لوامع' اور 'طوامع': دل پر انوار الٰہی کی کیفیات کا ظاہر ہونا ہے، یہ پہلا درجہ ہے۔ جس کو 'لوامع' کہتے ہیں وہ اس کے بعد کا درجہ ہے، 'طوامع' یعنی دل پر معارف کا طلوع ہونا۔

(۱۳)'حقیقت': یعنی وہ صحیح صورت واقعہ و حال جو کائنات کے پس پردہ کار فرما ہے۔ اس کے حصول سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات معلوم ہوتے ہیں اور معرفت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

(۱۴)'ملجاء' اور 'منجاء': 'ملجاء' اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں آدمی پناہ لے سکے' یا خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر سکے اور 'منجاء' اس ہستی کو کہتے ہیں جو آلات و آفات سے نجات دلائے۔ مسالک کے نزدیک یہ دونوں حیثیتیں اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوتی ہیں۔

(۱۵)'صفت': وہ شے جو اپنی ذات کے ساتھ موجود نہ ہو، مثلاً حسن، عدل، رحم وغیرہ۔

حواشی:

۱۔ The New Encyclopaedia of Britannica Vol.XI P. 355(USA,1995)

۲۔ براؤن: تاریخ ادبیات ایران ص ۲۸۳

۳۔ Mohammad Iqbal : The Development of Metophysis in Persia

فلسفہ عجم اردو ترجمہ میر حسن الدین۔ ص ۵۷ (حیدر آباد ۱۹۵۶)

۴۔ ایضاً ص ۵۸

۵۔ Macdonald D.B. Aspects of Islam. p.161 (Now York,1911)

۶۔ فلسفۂ عجم ص ۵۷

۷۔ فلسفۂ عجم ص ص ۱۰۴۔۱۰۱

۸۔ بخاری: لباس ۱، ترمذی: لباس ۱۰ اور ابن ماجہ: لباس ۱ وغیرہ

۹۔ Massignon Louis : Essi Sur Les Origines dus Lexique Technique de Mystique Musulmane p.155 (1954)

۱۰۔ قرآن: الصافات ۳۷/۱

۱۱۔ Z.D.M.G.: NLDEKE 48 P. 45

۱۲۔ ابو قاسم قشیری: رسالۃ، باب التصوف

۱۳۔ قرآن: البقرہ ۲/۱۲۹

۱۴۔ قرآن: آل عمران ۳/۳۱

۱۵۔ شیخ علی ہجویری: کشف المحجوب ص۔۸۸ اردو ترجمہ: طفیل احمد (دہلی جنوری ۱۹۷۹ء)

۱۶۔ کشف المحجوب ص ص ۹۰۔۸۹

۱۷۔ قرآن: البقرہ ۲/۵

۱۸۔ قرآن: البقرہ ۲/۱۳۱

۱۹۔ قرآن: آل عمران ۳/۱۷

۲۰۔ قرآن: النساء ۴/۱۴۶

۲۱۔ قرآن: التوبہ ۸/۱۱۲

۲۲۔ کشف المحجوب ص ۹۳

۲۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۶ ص ۴۳۰ (لاہور ۱۹۶۲ء)

۲۴۔ ایضاً ایضاً ص ۴۱۹

۲۵۔ Moojam Monem: An Introduction to Shia Islam pp 237-40 (Delhi 1985)

۲۶۔ محمد حسین طباطبائی: شیعہ در اسلام (اردو ترجمہ) ص ۹۴
۲۷۔ الشرف (ملفوظات شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری: اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی) ۱۹۶ (نالندہ ۱۹۸۰ء)
۲۸۔ Mohammad Heikal : Autum of Fury The Association of Sadat P.127 (Gorgi Books 1983) :
۲۹۔ معارف اسلامیہ ج ۶ ص ۴۲۰
۳۰۔ کشف المحجوب ص ص ۴۴۔۱۲۹
۳۱۔ معارف اسلامیہ ج ۶ ص ۴۲۰
۳۲۔ قرآن: الاسراء ۱۷/۱
۳۳۔ جوامع الکلم (ملفوظات سید محمد گیسودراز مرتبہ سید محمد حسینی) ص ص ۲۸۔۲۷ (کان پور ۱۹۳۷ء)
۳۴۔ محمد جمال قوام: قوام العقائد (اردو ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی) ص ص ۱۰۶۔۱۰۵ دہلی ۱۹۹۴)
۳۵۔ مشکوٰۃ شریف: کتاب اللباس ص ۳۷۵
۳۶۔ صحیح بخاری: کتاب اللباس ص ۳۴۱
۳۷۔ کشف المحجوب ص ۹۸
۳۸۔ ایضاً ص ۶۸
۳۹۔ قوام العقائد ص ۱۰۹
۴۰۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰۷
۴۱۔ قرآن: التوبہ ۹/۱۱۱
۴۲۔ قرآن: الفتح ۱۸/۴۸
۴۳۔ قوام العقائد ص ۱۰۷
۴۴۔ خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت ص
۴۵۔ خلدی: الفہرس ۱۸۳

۴۶۔ قشیری: الرسالہ (ترجمہ سید بندہ نواز گیسودراز) ص۱۵۸ (سالار جنگ لائبریری، حیدر آباد)

۴۷۔ ابن ابی اصیبہ: عیون ج۲ ص۲۵۰

۴۸۔ کشف المحجوب ص۲۴۰۔۲۴۷

۴۹۔ ایضاً ص ۲۴۷

۵۰۔ کشف المحجوب ص۲۶۷

۵۱۔ ایضاً ص۲۷۲

۵۲۔ قرآن: المائدہ۵/۵۴

۵۳۔ کشف المحجوب ص۱۰۶

۵۴۔ ایضاً ص۳۸۲

☆☆☆☆

حجت الاسلام والمسلمین

جناب محمود محمدی عراقی

سرپرست وصدر محترم، تنظیم ثقافت وارتباطات اسلامی

جمہوری اسلامی ایران

کا اجمالی تعارف

حجت الاسلام جناب محمود محمدی عراقی ۱۹۶۳ء میں کرمان شاہ کے ایک علمی وعرفانی اور دینی و صاحب تقویٰ خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد بزرگوار مرحوم حاج آقا بزرگ محمدی عراقی درحقیقت حوزہ علمیہ اراک سے وابستہ ایک نامور شخصیت کے حامل تھے اور محمدی عراقی کے نام سے مشہور تھے۔(واضح رہے کہ اس زمانے میں اراک کو ایرانی عراق کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا)۔اس دور کے مرجع تقلید مرحوم شیخ مرتضیٰ انصاری نے ان کی علمی وعرفانی صلاحیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہیں کرمانشاہ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ کرمان شاہ چلے گئے اور اس علاقے کے عوام اور علمی معاشرہ کی خدمت میں ہمہ تن سرگرم ہوگئے۔اس کے بعد ان کے والد بزرگوار حجت الاسلام والمسلمین بہاءالدین محمدی عراقی نے اس علاقے کے لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے ۱۹۹۲ء میں جام شہادت نوش کیا۔

جناب محمدی عراقی نے کرمان شاہ کے علاقائی مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد دینی تعلیمات میں مکمل مہارت حاصل کرنے کے لئے وہ قم روانہ ہوگئے اور وہاں انہوں نے مذہبی تعلیمات کے ساتھ ہی ساتھ جدید علوم حاصل کرنے میں غیر معمولی کوشش کی۔ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کی راہ میں انہوں نے گرانقدر اور ناقابل فراموش خدمت انجام دی اور اس سلسلے میں گوناگوں رنج و مصائب بھی جھیلے۔

طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے آیت اللہ شہید ڈاکٹر بہشتی اور شہید آیت اللہ قدوسی جیسے نامور علماء و فضلاء اور بزرگان علم و ادب سے کسب فیض کیا اور حوزہ علمیہ میں موجود علوم متداولہ پر مکمل دسترس حاصل کرتے ہوئے انہوں نے شعبہ فلسفہ اور شعبہ علوم قرآنی میں لازمی علمی مدارج طے کئے۔ مثالی علمی صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے امام خمینی (قدس سرہ) اور آیت اللہ گلپائگانی (قدس سرہ) نے متعدد موقعوں پر آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی اور سماجی سرگرمیوں کی ترتیب و تنظیم کے بعد انہوں نے مختلف انقلابی اداروں کی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر سنبھالیں اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں، جو ان کی زندگی کا اہم حصہ رہی ہیں، ہمہ تن سرگرم عمل رہے۔ خصوصی طور پر وہ سماجی علوم اور سماج شناسی کے مطالعہ و تحقیق میں لگے رہے اور دینی درسگاہ اور یونیورسٹی کے درمیان گہرے روابط و باہمی تعاون جیسے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں لازمی خدمات انجام دیتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ موصوف نے کئی برس تک شعبۂ سماج شناسی کی سرپرستی کا کام بھی انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ملک کے نامور اور نمایاں استادوں میں سے ایک ہیں اور علمی مراکز نیز یونیورسٹیوں میں درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق میں لگے رہنا ان کا اہم مشغلہ ہے۔ یونیورسٹی کے نوجوان طالب علموں اور تجربہ کار استادوں کے درمیان ان کی سرگرم موجودگی کا مقصد ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کی مشکلات کو دور کرنا رہا ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

جناب آقای محمدی عراقی ثقافتی انقلاب سپریم کاؤنسل اور یونیورسٹیوں میں ولی فقیہ کے نمائندوں کی مجلس عالیہ کے اہم رکن ہیں اور اسلامی علوم و معارف کی تبلیغ و اشاعت نیز یونیورسٹیوں

میں ثقافتی سرگرمیوں کی پیشرفت میں نمایاں خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تہران یونیورسٹی میں نمائندہ ولی فقیہ کے عہدہ پر بھی فائز رہے ہیں اور اسلامی علوم و سماج شناسی جیسے اہم موضوع پر ان کے مختلف مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔

دفاع مقدس یعنی ایران پر مسلط کردہ عراقی جنگ کے دوران وہ ایرانی فوج میں امام خمینی (قدس سرہ) کی نمائندگی کرنے والی جماعت کے سرپرست مقرر کئے گئے تھے۔ واضح رہے کہ یہ عہدہ خود امام خمینی نے ان کے سپرد کیا تھا۔ بہر حال موصوف نے دشمن کی فوج سے ٹکرانے والے ایرانی فوجیوں کے درمیان علمی اور ثقافتی سطح کو اونچا اٹھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان تمام گرانقدر خدمات اور غیر معمولی استعداد و صلاحیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان کی جانب سے تنظیم تبلیغات اسلامی کی مدیریت اور سرپرستی کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی اور اس مدت کے دوران موصوف نے انقلابی ارمانات اور اسلامی تمدن کی انسان ساز ثقافت کی حفاظت کے سلسلے میں نمایاں اور قابل ذکر خدمات انجام دیں جس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تنظیم ثقافت وارتباطات اسلامی کی مجلس اعلیٰ کی سفارش اور رہبر معظم کی تائید کے بموجب موصوف کو اس عظیم الشان ثقافتی تنظیم کا سرپرست و مدیر اعلیٰ بنادیا گیا۔

امید ہے کہ خداوند عالم کی خصوصی عنایت اور اس تنظیم سے وابستہ جملہ خدمت گزاروں اور عہدیداروں کے بھرپور تعاون سے موصوف اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے میں کامیاب رہیں گے جس کا اہم اور بنیادی مقصد اسلامی جمہوریہ ایران کے فرہنگ و تمدن کی وسعت، اسلامی انقلاب کی اعلیٰ قدروں کا فروغ اور دنیائے اسلام و دنیائے بشریت کی خدمت انجام دینا ہے۔ خداوند عالم ہم لوگوں کو ان اعلیٰ مقاصد کی راہ میں ہر ممکن تعاون کرنے کی تکمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

☆☆☆☆

بین الاقوامی ادارہ نمائشگاہ قرآن۔ تہران

کا

اجمالی تعارف

دنیائے اسلام میں مختلف النوع فن، ہنر اور کاریگری کی ایجاد وترویج کا بنیادی اور اصلی سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ اس کی الہام بخش نورانی آیات نے مختلف شکل وصورت میں رونما ہونے والے فنون کی ایجاد میں کلیدی کردار ادا کیا ہے جیسے خوشنویسی، مرصع کاری، تذہیب وتزئین، کتاب آرائی، جلد سازی اور لکڑی ودفتی وغیرہ سے بنائے گئے رحل وجزدان وغیرہ۔ ماہرین فن اور ہنر مند افراد نے اس کتاب سے الہام حاصل کرتے ہوئے ایسے عمدہ، دیدہ زیب، دلکش اور گرانقدر فنی نمونے خلق کئے ہیں جو آج دنیا کے تمام ممالک بالخصوص اسلامی ممالک کے عجائب گھروں اور نایاب ذخیروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

عالمی ادارہ نمائشگاہ قرآن کے مقاصد:

۱۔ بیرونی ممالک کے ہنری، ثقافتی، علمی اور تحقیقی مراکز میں موجود قرآنی نعمتوں کا تعارف

۲۔ بیرونی ممالک کے خادمین قرآن کریم کی لازمی حوصلہ افزائی

۳۔ قرآنی شعبوں میں سرگرم دانشوروں، مفکروں اور فنکاروں کے تجربات کا تبادل

۴۔ ایران اور بیرونی ممالک میں موجود قرآنی مراکز اور شخصیتوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا

۵۔ مختلف شعبوں میں ایران میں کی جانے والی قرآنی کوششوں سے دنیا کو آگاہ کرنا

۶۔ قرآن مجید کے نادر ونایاب اور جدید وخاص نسخوں کی جمع آوری ونمائش کا اہتمام

۷۔ قرآنی علوم و معارف کے سلسلے میں پوری دنیا میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات اور علمی و تحقیقی منصوبوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا۔

سر دست اس عالمی ادارۂ قرآن کا یہ ارادہ ہے کہ خالق قرآن کی تائید و حمایت کے سہارے جس مہینے میں قرآن ناطق نے اپنے معشوق کی آواز پر لبیک کہا اسی رمضان المبارک کے مہینے میں قرآن پناہ اور قرآنی احکام کی پیروی کرنے والے عوام کے سامنے قرآنی آثار اور نمونوں کی ایک جھلک پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

عالمی ادارۂ نمائشگاہ قرآن کی سرگرمیوں کے شعبے۔

۱۔ خوشنویسی کے نمونے: اسلامی ہنر کے مختلف شعبوں کے درمیان خوشنویسی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جو کلام الٰہی کی وسعت کے ساتھ عالم وجود میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام اسلامی ملکوں میں پھیل گئی۔ اس "ہنر قدسی" کی عظمت و بلندی، کا فنکار و خوشنویس کی پاکیزگی نفس، طہارت روح اور سلامتی ذہن سے براہ راست اور گہرا تعلق ہوتا ہے اور مخاطب کے قلب و ذہن پر جادوئی اثرات مرتب کرتی ہے اور نفس کو غیر معمولی "صفا و پاکیزگی" حاصل ہو جاتی ہے اور طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ قرآنی آیات کی کتابت سے فن خوشنویسی کو ایسی شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے کہ ہر دیکھنے والا خود بخود اس کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھنے والے کی روح کو جلاء بخشتی ہے اور ساری خرابیوں کو دور ہٹا دیتی ہے۔ فن خوشنویسی کا تاریخی مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی کتابت اس فن کی ایجاد و ترقی کا باعث رہی ہے۔

۲۔ عبارتوں کی آرائش و زیبائش: اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم مختلف النوع فن و ہنر کی ایجاد و تخلیق کا باعث رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نئے فنون کو جنم دیتا رہا ہے۔ صدر اسلام میں پہلے ہر سورہ کے آغاز والی آیات کو غیر معمولی طور پر سجایا جاتا تھا۔ سجاوٹ کے ذریعہ سورہ کے آغاز و اختتام اور نئے سورہ کی شروعات کی نشاندہی ہوا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ دیگر کتب کی عبارتوں کی آرائش و زیبائش کا چلن ہو گیا اور کچھ ہی دنوں بعد اس سجاوٹ

نے ایک آزاد فن کی شکل اختیار کرلی اور اس شعبے میں مختلف مکاتب فکر اور روش کار رائج ہوتی چلی گئیں۔

۳۔ عبارتوں کی طلاء کاری: اس کو تذہیب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور اس سے وہ سجاوٹی نقوش مراد ہوتے ہیں جس میں لاجوردی زمین پر کالے خطوط کے ساتھ طلاکاری کا کام انجام دیا جاتا ہے اور اگر اس میں دوسرے رنگوں کا بھی استعمال کیا گیا ہو تو اس کو "ترسیع" یا "تذہیب مرصع" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

درحقیقت اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اسلامی ثقافت کی عظمت وسربلندی کے ساتھ طلاء کاری کے ہنر کو بھی غیر معمولی شہرت مقبولیت حاصل ہوئی اور خطی کتابوں کی کتابت کے ذریعہ کتاب خوانی اور کتابت دوستی کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

۴۔ قرآنی مضامین کے ساتھ روایتی ہنر: درحقیقت دستکاری روایتی ہنر کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کے لوگ پھول، لکڑی کپڑا وغیرہ کی مدد سے کسی مشین کی مدد کے بغیر اپنے ہاتھوں سے خوبصورت اور دیدہ زیب اشیاء تیار کیا کرتے تھے۔ دستکاری کے ہنر پر قرآنی آیات کے اثرات کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مٹی، چینی مٹی، پتھر اور کپڑوں پر قرآنی آیات کے نقش ونگار اور زردوزی کے بہترین نمونے اس فن کی ترقی کا پتہ دے رہے ہیں۔ یہ نمونے درج ذیل شعبوں میں آج بھی موجود ہیں۔

۱۔ قرآنی نسخوں کی جلد بندی وصحافی

۲۔ کاسہ گری

۳۔ چینی مٹی کے برتن پر نقش ونگار ابھارنا

۴۔ زردوزی

۵۔ نازک کاری اور لکڑی پر خوشنما عبارتوں کو ابھارنا

۶۔ آئینہ کے چھوٹے ٹکڑوں کے ذریعہ تزئین وسجاوٹ کا کام

۵۔ تصویری اور صوتی کمپیوٹر:

سر دست اطلاع رسانی کی دنیا میں غیر معمولی ترقی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ملکی سطح پر اطلاعاتی مراکز نے قرآنی اور اسلامی علوم و معارف کے سلسلے میں جو ترقی کی ہے اس کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے نیز دیگر اسلامی ممالک کے ماہرین کمپیوٹر نے اسلامی علوم و معارف کی اشاعت کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دئے ہیں ان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے، کمپیوٹر مراکز کو بھی اس عالمی نمائش میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔

۶۔ اسلامی ممالک کی خواتین کی قرآنی سرگرمیوں کی نمائش:

قرآنی علوم و معارف میں خواتین کی مفید و کارآمد سرگرمیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے عالمی ادارہ نمائش گاہ قرآنی علوم کا یہ ارادہ ہے کہ اس نمائش میں قرآن علوم کے مختلف شعبوں میں عورتوں کی ثقافتی اور فنی سرگرمیوں کو منظر عام پر پیش کرے۔

۷۔ خادمان قرآن کی حوصلہ افزائی:

قرآن کریم کے خادمین کی عظمت و سربلندی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس نمائش کے دوران ان برگزیدہ روزگار افراد کی حوصلہ افزائی کا معقول اہتمام کیا گیا ہے۔

۸۔ عمدہ نمونوں کی خریداری:

عالمی ادارہ نمائش گاہ کی جانب سے مختلف ہنر و فن کے عمدہ نمونوں کی خریداری کا بھی معقول اہتمام کیا گیا ہے۔

☆☆☆

شہر علی گڑھ میں

کل ہند ''خواتین اسلام'' کا عظیم الشان سالانہ اجتماع

از: عنبر زہرا

سابق پرنسپل جامعۃ الزہرا، لکھنؤ

عہد حاضر کے پر آشوب دور میں خواتین خصوصاً نوجوان نسل کی خواتین کی رہنمائی کے لئے ایسے اجتماع اور جلسوں کے انعقاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جن میں تاریخ ساز اور انقلابی ذہن و فکر کی علمبردار مقدس خواتین کی مثالی زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے تاکہ ان کی حیات طیبہ کی روشنی میں مسلمان عورت اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکے۔

چنانچہ علی گڑھ میں مقیم کچھ بیدار مغز، علم دوست، دیندار اور مخیّر قوم خواتین کی انقلابی فکر وسعی سے خواتین اسلام کے سالانہ اجتماع کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس تحریک کی بانی اور روح رواں خوش فکر شاعر جناب محرم علی شہرت صاحب کی اہلیہ محترمہ نسیم شہرت ہیں اور نامور ذاکرہ اہلبیتؑ محترمہ نادر جہاں صاحبہ کی سرپرستی اور تعاون نے اس تحریک کو جلا بخشی۔

پہلا جلسہ ۱۹۹۹ء میں ''یوم فضہ'' کے نام سے ہوا۔ سال گذشتہ یوم خدیجۃ الکبریٰ منایا گیا۔ ان جلسوں میں علی گڑھ میں مقیم ملک کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے علاوہ بیرون علی گڑھ سے بھی صاحب عقل و فکر، اور علم و دانش و شعر و سخن میں مہارت رکھنے والی خواتین کو مدعو کیا جاتا ہے جو اپنی تقریر اور اپنے منظوم کلام سے مسلم خواتین کو اسلام کی اسوہ و نمونہ خواتین کی پیروی کی طرف راغب کرتی ہیں۔

امسال بھی علی گڑھ کی علم پرور اور ادب نواز سرزمین پر خواتین کا ایک عظیم الشان جلسہ ۱۱ر نومبر ۲۰۰۱ء کو "خواتین اسلام" کے نام سے محترمہ نسیم شہرت کے دولتکدہ "قصر زہرا" میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی کارروائی دو نشستوں میں انجام پائی۔ پہلی نشست کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ علوم سماجیات کی پروفیسر منصورہ حیدر صاحبہ نے اور دوسری نشست کی صدارت محترمہ نادر جہاں صاحبہ نے فرمائی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔ اس کے بعد کچھ بچیوں نے بڑے دلکش انداز میں یہ ترانہ "نرجس کے پسر نرجس کے پسر غیبت سے خدارا آجاؤ۔ درھم ہے نظام شام وسحر، غیبت سے خدارا آجاؤ" پیش کیا۔ یونیورسٹی میں زیر تعلیم نوعمر طالبات نے بڑی عمدہ تقریریں کیں۔ جن میں محترمہ زینب وسیم نے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے حیات وکارناموں پر، محترمہ عائدہ نے جناب صفیہ بنت عبدالمطلب پر، محترمہ شگفتہ نے حضرت زینب (س) پر اظہار خیال کیا۔ علی گڑھ میں مقیم معروف وھر دلعزیز ذاکرہ محترمہ شہناز صاحبہ نے جناب نرجس خاتون اور سائنس کی استاد رعنا بلقیس نے جناب فاطمہ بنت اسد کی زندگی کی اہم اور مثالی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے آج کی خواتین کو موجودہ حالات میں اسلامی حدود میں رہ کر زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ خواتین کا گھر سے باہر کام کرنا قابل مذمت نہیں لیکن باہری ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے اہم فرائض کو پوری طرح نبھانا چاہئے۔۔۔۔ اولاد کی دینی ودنیوی تعلیم وتربیت کرنا اور صحیح تربیت کر کے معاشرے کو اچھے افراد فراہم کرنا عورت کی اہم ذمہ داری ہے۔ گھر کے ماحول اور نظام میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے خواتین کو اپنے مزاج میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔

محترمہ شہناز صاحبہ، جو خود اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں، امام عصر (عج) کی والدہ گرامی جناب نرجس خاتون پر بڑی سیر حاصل تقریر کی اور خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا مانگنے کا طریقہ بتایا۔ پروفیسر منصورہ حیدر صاحبہ نے بھی اس بات پر زور دیا کہ آج خواتین گھر سے باہر میدان عمل میں مشغول ہیں لیکن انھیں اپنے گھریلو فرائض پر بھی پوری توجہ دینی چاہئے۔ اور شوہر پر اپنی برتری نہیں جتانی چاہئے بلکہ اس کی ذات کو اہمیت دینی چاہئے۔ اور زن وشوہر دونوں کو مل کر گھر کے مسائل اور ذمہ داریوں کو نبھانا چاہئے۔ امراض چشم کی ماہر ڈاکٹر فاطمہ عذرا نے "فرائض نسواں" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے

کہا کہ آج جب خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش کاموں میں مشغول ہیں اور اب کفالت کی ذمہ داری کو، جو پہلے فقط مردذات سے مخصوص ہوا کرتی تھی، اب عورت نے بھی سنبھال لی ہے لہذا جو ذمہ داریاں پہلے صرف عورتوں سے مخصوص تھیں ان میں مردوں کو بھی تعاون کرنا چاہئے لیکن اس سلسلے میں زورزبردستی سے نہیں بلکہ عورت کو اپنے علم ودانش کا استعمال کر کے نہایت سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔ گھر میں سکون ہو تب ہی مقصد حیات پورا ہو سکتا ہے۔ وہ آزادی بے معنی ہے جہاں عورت تنہا کھڑی ہو نہ گھر بار ہو اور نہ بال بچے۔ لہذا کام اور فرائض میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ لکھنؤ سے تشریف لانیوالی نوجوان مقررہ محترمہ فرح عابدی نے "خواتین اسلام" کے موضوع پر اپنی تقریر میں اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ "عصر حاضر عورتوں کی آزادی کا علمبردار ہے" انھوں نے کہا کہ اس دور نے نہ صرف عورت کے حقوق کی حفاظت نہیں کی بلکہ عورت کے وقار کو پامال کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں عورت کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنائے جارہے ہیں لیکن عورت کو اپنے مقام اور اپنے حقوق کی پہچان اور معرفت ہی نہیں ہے اس لئے وہ موجودہ نام نہاد آزادی اور ترقی پر بہت خوش ہے۔ انھوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ اخبار ورسائل اور ٹی وی وغیرہ میں عورت کو اشتہار کے لئے استعمال کیا جانا عورت کی ذلت ورسوائی کی انتہائی منزل ہے۔ علی گڑھ کی ایک نوجوان مقررہ سلطنت زیدی نے اپنی پرجوش تقریر میں عورت کے فرائض اور اس کے حقوق ومراتب کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے پر زور دیا۔ انھوں نے عورت ومرد کی خلقت میں فرق کو خدا کی رحمت کی نشانی بتایا۔ عورت کا مرد سے پہلے بالغ ہو جانا اس پر ظلم نہیں بلکہ یہ اس کا شرف ہے کہ وہ مرد کے مقابلے میں جلد منزل کمال تک پہونچ کر معاشرہ کا حصہ بن جاتی ہے اور اس کو حقوق وفرائض کا پہلے ذمہ دار بنا دینا بہت بڑا اعزاز ہے۔ نائیجیریا میں تقریباً ۲۵ سال تک انگریزی زبان وادب کی تدریس کے بعد فی الحال علی گڑھ میں مقیم جلسہ کی ایک اور مقررہ محترمہ شبیہ زہرا کامون پوری نے "اسلام اور تعلیم نسواں" کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی جس کا اردو ترجمہ ناز فاطمہ صاحبہ ساتھ ساتھ کرتی جارہی تھیں۔ انھوں نے قرآن واحادیث کی روشنی میں عورت کی تعلیم کو ضروری بتاتے ہوئے کہا کہ مذہبی اور جدید علوم کا تال میل ایک مکمل عورت کی تعمیر کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ آج مسلمانوں

کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دے رہے ہیں جب کہ بچے کا پہلا مدرسہ ماں کی آغوش ہوتا ہے۔

لکھنؤ سے آنیوالی ایک اور معزز مہمان "ٹائمز آف انڈیا کی معاون ایڈیٹر محترمہ کلثوم مصطفے نے اپنی تقریر میں خواتین کی سیاسی بیداری پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ سال جب میں اس جلسہ میں شرکت کرنے علی گڑھ آئی تھی تو خواتین نے ووٹر لسٹ سے مسلمانوں کے نام خارج کردئے جانے کی بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ لوگ سمجھ چکے ہیں کہ آج مسلمان کمزور نہیں۔ پس مسلمانوں کو اپنی طاقت کا صحیح وقت پر اور صحیح استعمال کرنا چاہئیے۔ آپ کے حقوق کوئی لے ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر آپ خود ہی آواز نہیں اٹھائیں گی تو لوگوں کو موقع دیں گی کہ وہ آپ کو کچل دیں اور یہ بات صرف محفلوں تک محدود نہیں رہنی چاہئیے۔

آخر میں صدر جلسہ محترمہ نادر جہاں صاحبہ نے "حضرت معصومہ قم" کے عنوان پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ آپ نے یاد دہانی کرائی کہ مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ البتہ سیاست سے مراد وہ سیاست ہے جس کا تعلق ملکی انتظام، قوموں کے استحکام اور ان کے عروج وزوال سے ہو اور جو زمانے کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔ آپ نے علم کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ علم حاصل کرنے کے ساتھ اپنے بزرگوں کی روش کو باقی رکھنا مذہب اور مذہبی اقدار کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ آپ نے کہا کہ علم حاصل کرنے کا مقصد صرف روزی روٹی حاصل کرنا نہیں بلکہ زندہ قوموں کی طرح زندہ رہ کر دوسروں کو زندہ رہنے کا حوصلہ دینا ہے۔ آپ نے مرد عورت دونوں کے لئے علم حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے بلند پایہ علماء نے اپنی بیٹیوں کو جوہر علم سے آراستہ کیا لیکن پتہ نہیں یہ خیال ذہنوں میں کہاں سے آگیا تھا کہ بیٹیوں کے ہاتھ میں قلم نہ دیئے جائیں۔ آپ نے معصومہ قم کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی چاروں بیٹیوں کا نام فاطمہ تھا۔ چاروں عالمہ فاضلہ تھیں اور چاروں کے مقبروں پر عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ معصومہ قم (س) سب سے بڑی تھیں۔ آپ قم میں دفن ہوئیں۔ شہر قم پر خداوند عالم کی خاص مہربانی ہے۔ قم دنیا کا سب سے بڑا علمی ودینی مرکز ہے۔ ائمہ کرام کی حدیثیں ہیں کہ ساری دنیا تباہ

ہو سکتی ہے، قم تباہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت معصومہ قم کے روضہ پر زائرین کی کثرت ان کی عظمت و تقدس کا پتہ دیتی ہے۔ محترمہ نادر جہاں صاحبہ نے حاضرین محفل کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ خواتین اسلام کی سیرت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے فرائض و حالات کا جائزہ لیں کہ کیا ہمارے شب و روز اسلام کے مطالبات کو پورا کرنے میں صرف ہو رہے ہیں یا اسلامی مطالبات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ہم خواتین کو میدان جنگ میں جا کر تلوار سے جہاد نہیں کرنا ہے۔ اپنے گھر اور اپنے خاندان کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے ادا کرنا ہی ہمارا جہاد ہے۔ ہمارا جہاد، زبان کا جہاد ہے۔ اخلاق کا جہاد ہے، نفس اور نظر کا جہاد ہے اور میدان جنگ کے لئے اچھے مجاہد تیار کرنا ہمارا جہاد ہے۔ آپ نے امام خمینی کا مشہور جملہ دہراتے ہوئے حاضرین جلسہ کو متوجہ کیا کہ جب امام خمینیؒ سے پوچھا گیا کہ استکباری طاقتوں سے مقابلے کے لئے آپ کے پاس فوج کہاں ہے تو آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا تھا "ہماری فوج کے جوان فی الحال اپنی ماؤں کی گودیوں میں پل رہے ہیں۔"

تقریروں کے درمیان نوگانواں سادات سے آئی ہوئی نوعمر بچیاں اور خواتین اپنی دلکش آواز اور دلنشیں لہجہ میں حضرت امام عصرعج کی خدمت میں منظوم خراج عقیدت پیش کرتی رہیں۔ ان میں شمس زہرا، اسماء عابدی صابرہ محسن، شگفتہ عابدی، فضہ عابدی، نذیر، غزالہ اور اقبال فاطمہ وغیرہ پیش پیش تھیں۔

بانی و منتظم جلسہ محترمہ نسیم شہرت کی نوعمر صاحبزادی شہوار عابدی نے بڑے خوبصورت انداز سے جلسہ کی نظامت کی۔

عین اسلامی روایت کے مطابق جلسہ مغرب سے قبل اختتام پذیر ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆